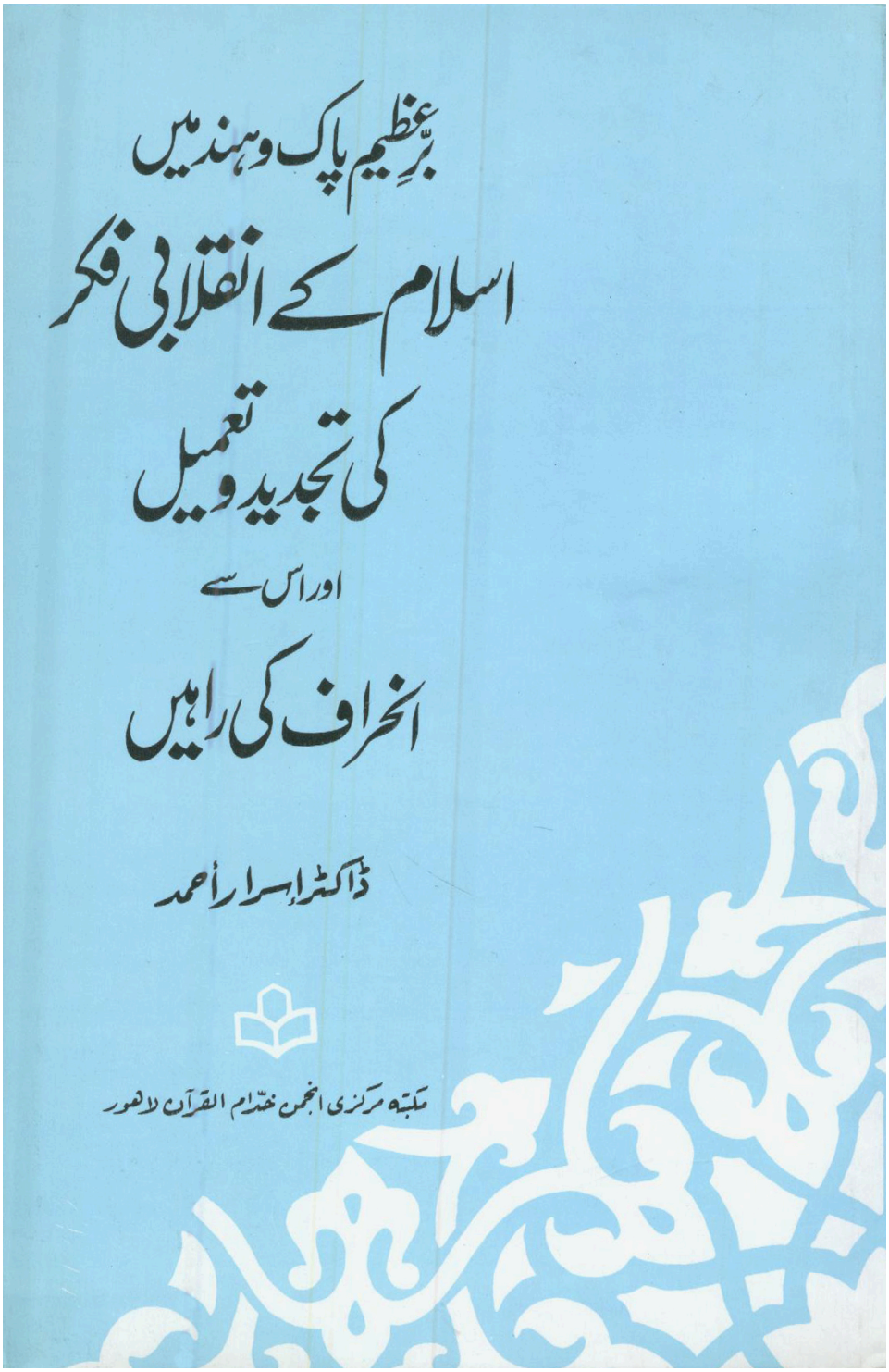


اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل

ڈاکٹر اسرار احمد

اسلام کا انقلابی فکر
اور اس کا زوال

اسلام کے انقلابی فکر کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ ----- دین و دنیا اور مذہب و سیاست کو یکجا کر کے ان کے مجموعے پر اللہ کی حاکمیت یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی قائم کرنے کی جدو جہد میں تن من دھن کے ساتھ حصہ لیا جائے تاکہ دین حق کے غلبے کی صورت میں وہ نظامِ عدل اجتماعی قائم ہو جائے جو انسانی حریت' اخوت اور مساوات کے معتدل اور متوازن مجموعے کی حیثیت سے خلق کے لیے خالق کی رحمت وربوبیت اور عدل وقسط کا جامع اور کامل مظہر بن جائے ----- اور علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار کے مطابق اس مقصد عظیم کے لیے تن من دھن لگا دینا' حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر جان دے دینا' دین حق کا لازمی تقاضا ہے ؎

مقامِ بندگی دیگر' مقامِ عاشقی دیگر
زنوری سجدہ می خواہی' زخاکی بیش ازاں خواہی
چناں خود رانگہداری کہ با ایں بے نیازی ہا !
شہادت بر وجودِ خود زخونِ دوستاں خواہی

اور صرف ان عظیم ہستیوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جنہوں نے خواہ اس مقصد کے لیے کوئی عملی اقدام اور اجتماعی جدو جہد نہ کی ہو' لیکن اپنی پوری زندگی ایسی کسی جدو جہد کی تمہیدی اور ابتدائی مساعی میں صرف کر دی ہو' جیسے مثلاً شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور علامہ اقبال مرحوم'

باقی جس مسلمان کی زندگی اس جہد وجہاد سے خالی اور سینہ اس راہ میں جان دینے کی آرزو سے محروم ہو وہ سورۃ الحجرات کی آیات ۱۴ اور ۱۵ کی رو سے ''قانونی مسلم'' تو ہو سکتا ہے ''حقیقی مومن'' ہرگز نہیں ہو سکتا اور ایک حدیثِ نبویؐ کی رو سے ایسے مسلمان کی موت ایک قسم کے نفاق پر واقع ہوتی ہے۔ (مسلمؒ عن ابی ہریرہؓ)

رہے وہ لوگ جو کسی ایسی جدو جہد میں بالفعل شریک رہے ہوں' پھر خواہ (i) اپنی کسی ذاتی کمزوری اور خامی کی بنا پر یا (ii) کسی نوع کے تکبر اور انانیت کے باعث یا (iii) کسی داعی اور قائد کی کم ہمتی سے بد دل ہو کر' یا (iv) اس میں ''خوئے دل نوازی'' کی کمی کی شکایت کی بنا پر' یا (v) اس کے کسی مرحلے پر غلط رخ اختیار کر لینے اور پھر اس پر ضد اور اصرار کے باعث' علیحدگی اختیار کر لیں --- ان میں سے جو لوگ اس جدوجہد سے بالکل دست کش ہو کر بیٹھ رہیں اور عضو معطل بن کر رہ جائیں ان سے بھی اللہ کے یہاں سخت جواب طلبی ہو گی' لیکن وہ لوگ جو اپنی بزدلی اور کم ہمتی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس فکر ہی کو مجروح کرنے کی کوشش شروع کر دیں وہ تو حدیث نبویؐ کے الفاظ: ''شَرُّ النَّاسِ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَائِ'' کے مصداقِ کامل' یعنی آسمان تلے کی بد ترین مخلوق شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ تاہم اس اہم حقیقت کی وضاحت کے لیے ایک اجمالی تاریخی تجزیہ ضروری ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف تو اپنے اور غیر' دوست اور دشمن' سب کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی بیس سالہ عظیم اور معجزانہ انقلابی جد وجہد کے ذریعے دین حق کے غلبے کی صورت میں متذکرہ بالا نظامِ عدل وقسط بالفعل قائم فرما دیا تھا ----- اور مزید یہ کہ یہ نظام اپنی کامل اور مکمل صورت میں آپ ﷺ کے انتقال کے بعد بھی کم از کم تیس برس تک قائم رہا۔ البتہ اس کے ضمن میں دو وسوسے اغیار اور اعداء نے پیدا کر دیے ہیں' جن کی جانب اجمالی اشارہ مناسب ہے۔ ان میں سے پہلا وسوسہ ایک ''طعنے'' کی صورت میں ہے' یعنی: ''اللہ کا عطا کردہ دین' اور صرف تیس برس کی قلیل مدت؟'' جس کا مسکت جواب یہ ہے کہ نظام اسلام کے بارے میں تو آپ بھی مانتے ہیں کہ یہ کم از کم ایک بار اپنی کامل

صورت میں قائم ہوا اور تیس برس تک قائم رہا' جبکہ جن نظاموں کا ڈھنڈورا آپ پیٹتے ہیں ان میں سے تو کوئی بھی آج تک اپنی اصل مجوزہ صورت میں کہیں ایک دن کے لیے بھی قائم نہیں ہو سکا۔ چنانچہ افلاطون کی ''ریپبلک'' تو خیر تھی ہی خیالی جنت' جس جمہوریت کا خواب والٹیئر اور روسو نے خود دیکھا اور دنیا کو دکھایا تھا اس کے بارے میں جمہوریت کے بڑے سے بڑے علمبردار بھی صرف یہی کہتے ہیں کہ ع ''چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!'' کے مصداق ابھی ہم اس کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں! رہا مارکس اور اینجلز کا ''غیر طبقاتی اور غیر ریاستی معاشرہ'' تو یہ خواب تو اپنی تعبیر کی ادنیٰ ترین جھلک دکھائے بغیر ہی طاقِ نسیاں کی زینت بن چکا ہے!

دوسرا وسوسہ اس ''مغالطے'' کی صورت میں ہے کہ تیس برس کے بعد اسلامی نظام بالکل ختم ہو

لیا تھا' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خلافت ِراشدہ کے اختتام پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی اختیار کردہ تعبیر کے مطابق دین ِحق کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی چھ منزلہ عمارت کی صرف چھٹی یعنی سب سے بلند منزل منہدم ہوئی تھی' بقیہ پانچوں منزلیں قائم رہیں' جو بعد میں ایک ایک کر کے کہیں ایک ہزار سال میں منہدم ہوئیں 'اور اس کے بعد بھی لگ بھگ دو سو سال تک کیفیت یہ رہی کہ ع ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی !'' ----- تیس برس بعد' یعنی خلافت راشدہ کے اختتام پر تو صرف یہ کمی واقع ہوئی تھی کہ حکومت کا نظام اسلام کے اعلیٰ ترین شورائی معیارات پر برقرار نہ رہا بلکہ اس میں قبائلی عصبیت کا عمل دخل ''شروع'' ہو گیا۔ تاہم اسے بھی پوری طرح ''ملوکیت'' کی صورت اختیار کرنے میں کم 'از کم ایک صدی کا عرصہ لگا اور ملوکیت اپنی پوری شان اور جملہ لوازم کے ساتھ بالفعل دورِ عباسی میں جلوہ گر ہو سکی۔

پھر یہ تو ہماری تاریخ کا نہایت شاندار اور قابل فخر باب' اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیم وتربیت کا عظیم مظہر ہے کہ خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے کے تدریجی عمل کے ہر مرحلے پر اصحابِ ہمت وعزیمت اس زوال اور انحطاط کو روکنے کے لیے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ چنانچہ اولین مرحلے پر سیدنا حسین بن علی

اور سیدنا عبد اللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہم اجمعین) اور درمیانی اور آخری مراحل میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے حضرت زید بن علی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے محمد بن عبد اللہ المعروف بہ نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبد اللہ (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) نے اس زوال کو اپنی جانوں کی قربانی کے ذریعے روکنے کی کوشش کی ---- اور اگر ان تمام حضرات کی مساعی دنیوی اور فوری اعتبار سے ناکام ہو گئیں تو اس سے ان پر ہرگز کوئی حرف نہیں آتا' اس لیے کہ دنیوی اور فوری اعتبار سے تو ان سے پہلے بے شمار انبیاء کرام علیہم السلام بھی دنیا سے ''ناکام'' ہی گزر گئے تھے !

افسوس ہے کہ آج کے دور میں بعض کم ظرف اور کم ہمت بلکہ بد باطن لوگ ان نفوسِ قدسیہ کا ذکر توہین آمیز انداز میں کر کے اور ان کے عظیم کارناموں کو خود ساختہ فقہی اور قانونی معیار پر پرکھنے کی کوشش کر کے اپنے خبث ِباطن کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنی کور چشمی کے باعث وہ اس تاریخی حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ فقہ اسلامی کے دونوں اولین ائمہ' یعنی فقہاء اسلام کے سید الطائفہ اور ''امام اعظم'' حضرت ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ اور حدیث نبویؐ کا پہلا مجموعہ مرتب کرنے والے امام دار الہجرت حضرت مالک ابن انس رحمہ اللہ علیہ نے حضرت نفس زکیہ رحمہ اللہ علیہ سے دامے درمے سخنے تعاون کیا تھا' جس سے بآسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر ان حضرات کو حسین بن علی اور عبد اللہ بن زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین کا زمانہ ملا ہوتا تو ان کا طرزِ عمل کیا ہوتا !

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جیسے ''ایمان'' کے لطیف اور ماورائی حقائق کو ارسطو کی منطق کی محدود میزان میں تولنا نا ممکن ہے' اسی طرح ان حضرات کی منوں ہی نہیں ٹنوں وزنی عزیمت کو ملوکیت کے ''نازک مزاجِ شاہاں تابِ سخن نہ دارد'' والے دور میں پروان چڑھنے والی ''فقہ'' کی سناروں والی نازک ترازو میں تولنے کی کوشش کرنا حماقتِ محض ہے!

بہرحال جب عالم اسلام میں حدیث نبویؐ کے الفاظ میں ''کاٹ کھانے والی ملوکیت'' اور ''جابرانہ بادشاہت'' کا نظام مستحکم اور متمکن ہو گیا اور اس کی پہلوٹھی کی بیٹی

بھی جوان ہو گئی' یعنی جاگیرداری بھی پوری طرح رائج ہو گئی' اور عوام کو اس ظالمانہ استبدادی نظام کو ایک امر واقعی کی حیثیت سے عملاً قبول کرنا پڑا تو اس کے لازمی اور منطقی نتیجے کے طور پر مسلمانوں کے دینی تصورات میں بھی تنزل کا عمل شروع ہو گیا۔ یوں اسلام رفتہ رفتہ ''دین'' کی بجائے صرف ایک ''مذہب'' کی صورت اختیار کرتا چلا گیا جس کا اصل موضوع ''عبادات اور رسومات'' ہوتی ہیں نہ کہ ریاست و سیاست! ہوتے ہوتے یہ بات تقریباً اصولِ موضوعہ کی حیثیت سے تسلیم اور قبول کر لی گئی کہ حکومت کا معاملہ تو علامہ ابن خلدونؒ کی اصطلاح کے مطابق صرف ''عصبیت'' ہی کی بنیاد پر چل سکتا ہے اور اس میدان میں تو لا محالہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' ہی کے اصول پر عمل ممکن ہے۔ رہے ''علمائِ دین'' تو ان کا کام اوّل تو ان امراء وسلاطین کی ''سول سروس'' میں خطیبوں' مفتیوں اور قاضیوں کی خدمات سر انجام دینا ہے۔ جو لوگ اس سے آگے بڑھ کر ''دین کی خدمت'' کی ہمت اور حوصلہ رکھتے ہوں وہ علوم اسلامی یعنی تفسیر' حدیث' فقہ اور علم کلام کو اپنی جولاں گاہ بنائیں' یا اگر اس کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو عوام کو وعظ و نصیحت اور تعلیم وتلقین کے ذریعے محبتِ الٰہی' اتباعِ رسولؐ اور ترجیح آخرت کی ''دعوت'' دیں اور ''تذکیر'' کا فریضہ ادا کرتے رہیں ----- اور جو اس سے بھی زیادہ ہمت اور عزیمت کے مالک ہوں وہ تزکیہ نفس اور سلوک کے مراحل خود بھی طے کریں اور دوسروں کو بھی کرائیں اور اس مقصد کے لیے خانقاہیں آباد کر کے بیٹھ رہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا! رہی سیاست اور حکومت تو یہ ''دنیا داروں'' کا کام ہے' اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ''نظام'' کو بدلنے کی کوشش تو ''خروج'' اور بغاوت ہے' جو کفر اور ارتداد سے بس کچھ ہی کم تر ہے!

اس تصور کے تحت ایک جانب ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری' ہوس کی وزیری

کے مطابق سلاطین و امراء اور منصب داروں اور سپہ سالاروں میں عیاشی وسفاکی اور ہوسِ ملک گیری بڑھتی چلی گئی' اور دوسری جانب مذہب صرف ایک ''پیشہ'' بن کر رہ گیا۔

اس کے ضمن مین معاصرانہ چشمک اورپیشہ ورانہ رقابت اور پھر مدرسہ وخانقاہ کی تقسیم اور ان کی باہمی منافرت کے باعث اخلاقی زوال کا عمل جس قدر جلد شروع ہوا اور جتنی تیزی سے بڑھا اس کا اندازہ طبقہ تبع تابعین سے تعلق رکھنے والے حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ کے اس شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ؎

وما افسد الدّین الا الملوک
واحبارُ سوءٍ و رُھبانھا

جس کی بہترین ترجمانی کی ہے ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے ُکشتۂ ملائی و سلطانی وپیری !

یہ امر یقینا بہت قابل غور ہے کہ اگر یہ مرض تبع تابعین کے دور ہی میں شروع ہو گیا تھا' جس کا شمار ''خیر القرون'' میں ہوتا ہے 'تو ع ''قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا !'' کے مصداق بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مزید ایک ہزار برس کا عرصہ گزر جانے کے بعد نوبت کہاں تک پہنچ گئی ہو گی !

الغرض' اب سے لگ بھگ تین سو برس قبل اِدھر عالم اسلام میں تو دینی و اخلاقی زوال اور قومی وسیاسی اختلال کی تاریکیاں ع ''زینہ زینہ اتر رہی تھی رات'' کے مانند شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی تھیں اور فی الجملہ وہ صورت پیدا ہو چکی تھی جس کا نقشہ علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

پیش ما یک عالم فرسودہ است
ملت اندر خاکِ او آسودہ است !

لیکن اُدھر وسطی یورپ میں ہسپانیہ کے ان مسلمانوں کے زیر اثر جو قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعے یورپ کو بیدار کر کے خود خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے کے باعث ع ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں !'' کی عبرتناک مثال بن چکے تھے' اصلاحِ مذہب اور احیاء العلوم کا غلغلہ بلند ہوا' جس کے نتیجے میں ایک جانب سائنس

اور ٹیکنالوجی نے تیزی سے ترقی کرنی شروع کی اور دوسری جانب انسانی حقوق بالخصوص حریت کا تصور اجاگر ہونا شروع ہوا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے جو ''قوت کا دباؤ'' بڑھا اس نے مغربی استعمار کی صورت میں افریقہ اور ایشیا کا رخ کر لیا اور اب سے تقریباً ڈھائی سو برس قبل سوائے سلطنتِ عثمانیہ کے تقریباً پورا عالم اسلام اس کے زیر نگیں آگیا۔ لیکن عجیب اور دلچسپ تضاد یہ ہے کہ گھر سے باہر بدترین نو آبادیاتی نظام کے قیام کے ساتھ ساتھ اہل یورپ نے خود اپنے گھر کے اندر انسانی حقوق کی بازیافت اور ظلم وجبر اور استبداد واستحصال کے خاتمے کی بھرپور جدوجہد شروع کر دی۔

اس انقلابی جدوجہد کا پہلا نتیجہ اب سے دو سو سال قبل انقلاب فرانس کی صورت میں ظاہر ہوا ،جس سے دنیا میں بادشاہت اور جاگیرداری کے خاتمے اور جمہوریت کی مختلف صورتوں کے رواج کا آغاز ہوا۔ لیکن چونکہ اس کے ساتھ ہی سائنسی ترقی کے نتیجے میں ''صنعتی انقلاب'' بھی رونما ہو چکا تھا لہٰذا اس جمہوریت نے عملی اعتبار سے ''سرمایہ داروں کی آمریت'' اور ع ''دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب'' کی صورت اختیار کر لی، جس کا شدید ردّ عمل اس صدی کے آغاز میں ''انقلابِ روس'' کی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہ وہ وقت تھا جب برِ عظیم پاک و ہند کے اس منظر پر علامہ اقبال فکرِ اسلامی کی تجدید اور ''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید'' کے دعوے اور اسلامی انقلاب کی زور دار دعوت کے ساتھ نمودار ہوئے، جس کے پس منظر میں تصوفِ اسلامی اور الف ثانی کے مجدد شیخ احمد سرہندی، علوم اسلامی کے مجددِ اعظم شاہ ولی اللہ دہلوی اور جہادِ اسلامی کے مجدد سید احمد بریلوی رحمہم اللہ کی تین سو سالہ تجدیدی مساعی کے اثرات موجود تھے۔

فکر کے میدان میں علامہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک جانب سائنس کو ''روحِ قرآن'' کا ظہور اور بروز، اور دوسری جانب عدلِ اجتماعی کی ان تمام اعلیٰ اقدار کو جن کا شعور یورپ میں اجاگر ہوا تھا ''نورِ مصطفی'' (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مستعار قرار دے کر دین اور دنیا کے فرق، مذہب اور سیاست کی علیحدگی، اور مشرق و مغرب کے فاصلے کو

آنِ واحد میں ختم کر کے رکھ دیا ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰ ؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ؐ است !

چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ حضرت علامہ نے ''ری پبلکن طرز حکومت'' کو اسلام کی روح کے عین مطابق قرار دیا۔ اور یہ تو ان کی جرأتِ رندانہ اور شانِ قلندری کا نمایاں ترین مظہر ہے کہ انہوں نے ''مارکسزم + خدا = اسلام'' کا فارمولا پیش کر دیا۔ اس لیے کہ اس میں کیا شک ہے کہ خدا کی حاکمیت ِمطلقہ کی تابع جمہوریت اور اللہ کی ربوبیتِ عامہ کے تقاضوں کو پورا کرنے اور کفالت ِعامہ کی ضمانت دینے والے نظام ہی کا نام ''نظامِ خلافت'' ہے' جس کا قائم کرنا مسلمانوں کا فرض منصبی اور اسلامی انقلاب کا مقصودو مطلوب ہے !

مزید برآں علامہ اقبال نے ایک جانب ''ایمان'' کا رشتہ ارسطو کی منطق یا افلاطون کے عالم مثال کی بجائے اعلیٰ ریاضی اور جدید طبیعیات' فلکیات' حیاتیات اور نفسیات کے ساتھ قائم کرنے کی سعی مشکور کا آغاز کیا' جس سے ''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کی راہ ہموار ہوئی ----- اور دوسری جانب ''اسلام کا انقلابی فکر'' بھی مرتب اور مدوّن کر دیا اور انقلاب کے طریق اور منہج کی بھی اجمالی نشان دہی کر دی۔ تاہم ان موضوعات پر قدرے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد
یکم مارچ ۱۹۹۴ء

حصّہ اوّل

بر عظیم پاک و ہند میں
اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل

کے سلسلے میں

علامہ اقبال

مولانا آزاد، اور مولانا مودودی کا حصہ

13

* باب اول

فکر اسلامی کی تجدید اور علامہ اقبال

* باب دوم

فکر اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ

* باب سوم

اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل کے ضمن میں
اب تک کی مساعی کا حاصل

*باب چہارم

اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں تدریج اور اس کے تقاضے

باب اوّل

فکرِ اسلامی کی تجدید
اور علامہ اقبال

علامہ اقبال نے یورپ کی علمی اور سائنسی ترقی کو روحِ قرآن کا ظہور اور بروز' اور عوام کے سیاسی اور معاشی حقوق کے تصور کو نورِ محمدی (ﷺ) سے ماخوذ اور مستعار قرار دینے' اور اسلام کے علمِ کلام کو افلاطونی تصورات کی دلدل اور ارسطو کی منطق کی بھول بھلیوں سے نکال کر جدید تجرباتی علوم کی اساس پر استوار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک جانب مغرب کے دو جدید عمرانی نظریات اور بنیادی سیاسی تصورات پر کڑی تنقید کرتے ہوئے مغربی تہذیب کو پوری خود اعتمادی اور جرأتِ رندانہ کے ساتھ چیلنج کیا' اور دوسری جانب نہ صرف یہ کہ اسلام کے اصل انقلابی فکر کی پوری ''مجددانہ'' شان کے ساتھ از سرِ نو تدوین کا فریضہ سر انجام دیا اور اللہ اور رسول ﷺ کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو عہدِ حاضر کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر اور حقوق انسانی کے بلند ترین تصورات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا' بلکہ انقلاب کا زور دار نعرہ لگاتے ہوئے اس کے منہج اور منہاج کو بھی کمال اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا۔

مغرب کے جن دو جدید عمرانی نظریات پر علامہ نے شدید تنقید کی وہ سیکولرازم اور نیشنلزم یعنی وطنی قومیت ہیں۔ ان کے ضمن میں علامہ کے خیالات اتنے واضح و بین اور معروف و مشہور ہیں کہ یہاں ان کی جانب صرف ایک اجمالی اشارہ کافی ہے۔ چنانچہ سیکولرازم علامہ کے نزدیک اس دور کا سب سے بڑا فتنہ اور دین اور سیاست کی علیحدگی فساد کی اصل جڑ ہے۔ مزید برآں انسانی حاکمیت کا تصور علامہ کے نزدیک کفر اور شرک

ہے' قطع نظر اس سے کہ وہ شخصی اور انفرادی ہو یا قومی اور عوامی۔ اس موضوع پر علامہ کے مشہور اور عام فہم اشعار میں سے تو یہ دو شعر سب سے زیادہ نمایاں ہیں: ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی !

اور ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری !

لیکن زیادہ لطیف انداز اور گہرے پیرائے میں یہ بات علامہ کی حیاتِ مستعار کے بالکل آخری دور کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر !

گویا علامہ کے نزدیک یورپ میں ''احیاء العلوم'' اور ''اصلاحِ مذہب'' کی تحریکوں کے زیر اثر آدم میں جو ''خود شناسی'' اور ''خود نگری'' کا شعور پیدا ہوا، وہ اصلاً تو درست تھا لیکن اسے ابلیس اور اس کے کارندوں نے ''عوامی حاکمیت'' کی صورت دے کر شیطنت کا سب سے بڑا مظہر اور ابلیس کا آلہ کار بنا دیا ہے۔ چنانچہ جو گندگی منوں اور ٹنوں کے حساب سے ماضی میں کسی فرعون اور کسی نمرود یا کسی قیصر اور کسی کسریٰ کے سر پر تاج کی صورت میں رکھی ہوتی تھی وہ آج تولہ تولہ یا ماشہ ماشہ ہر انسان کے سر پر لیپ دی گئی ہے، لیکن نجاست بہرحال نجاست ہے، خواہ منوں اور ٹنوں کے حساب سے ہو، خواہ تولوں اور ماشوں کی مقدار میں !

رہا وطنی قومیت کا جدید تصور تو اس کے ضمن میں تو واقعہ یہ ہے حضرت علامہ نے بارہ اشعار پر مشتمل جو نظم اردو میں کہی اور تین اشعار پر مشتمل جو قطعہ فارسی میں کہا ان کے بارے میں، میں پورے وثوق کے ساتھ وہی بات کہنے کو تیار ہوں جو امام شافعیؒ نے سورۃ العصر کے بارے میں کہی ہے ----- اس موضوع پر امام شافعیؒ کا زیادہ مشہور قول تو یہ ہے

کہ ''اگر لوگ صرف اس سورت پر تدبر کر لیں تو یہ ان (کی ہدایت) کے لیے کافی ہے !'' لیکن ان کا ایک دوسرا زیادہ فصیح اور بلیغ قول وہ ہے جو مفتی محمد عبدہٗ نے اپنی تفسیر پارۂ عم میں نقل کیا ہے، یعنی: ''اگر قرآن میں سوائے اس ایک سورت کے اور کچھ بھی نازل نہ ہوتا تب بھی یہ لوگوں (کی ہدایت) کے لیے کافی ہوتی !'' علیٰ ہٰذا القیاس مجھے یہ

کہنے میں ہرگز کوئی باک نہیں ہے کہ اگر علامہ مرحوم نے ساری عمر میں صرف یہی اشعار کہے ہوتے تب بھی وہ خود اپنے ہی شعر ؎

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ خاک میں اِس بُت کو ملا دے

کے مصداق مغربی تمدن کے لیے سب سے بڑے ''بت شکن'' اور ''قومیت ِاسلام'' کے مجددِ اعظم قرار پانے کے مستحق ہوتے !

اس معاملے میں بھی یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت علامہ نے اپنی اردو نظم (مشمولہ ''بانگ دِرا'': صفحات ۱۶۰' ۱۶۱) میں ایک ''سیاسی تصور'' کی حیثیت سے ''وطن'' کو ایک جانب عہد ِحاضر کے ''تازہ خدائوں'' میں سب سے بڑا خدا اور تہذیب جدید کے آزر کے تراشے ہوئے نئے اصنام میں سب سے بڑا ''صنم'' قرار دیا۔ گویا ''وطنیت'' کو سب سے بڑے شرک سے تعبیر کیا جو از روئے قرآن نا قابل معافی جرم ہے (سورۃ النسائ: آیات ۴۸ اور ۱۱۶) اور دوسری جانب نوع انسانی کے لیے نہایت تباہ کن اور مہلک بیماری قرار دیا' جس کے بطن سے ''مخلوقِ خدا'' میں تفرقہ وعداوت اور ''اقوام جہاں'' میں باہمی ''رقابت'' جنم لیتی ہے' جس کے نتیجے میں سیاست اخلاق سے ''خالی'' اور تجارت'' ذریعہ ''تسخیر'' (یعنی امپریلزم کا آلہ) بن جاتی ہے ----- اور ان سب کا نتیجہ یہ کہ ''کمزور'' اقوام تباہ وبرباد ہو کر رہ جاتی ہیں اور ان کا گھر ''غارت'' ہو جاتا ہے !

رہا فارسی قطعہ تو اس کے ضمن میں اگرچہ مولانا حسین احمد مدنی کا یہ اعتراض تو بالکل بجا تھا کہ ''میں نے ملت نہیں' قوم کا لفظ استعمال کیا تھا !'' اور اس پر حضرت علامہ نے بھی نہایت وسعت ِقلبی اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معذرت کر لی تھی' لیکن

مولانا مدنیؒ کے اس قول کے بارے میں کہ ''میرا یہ کہنا کہ آج کل قومیں وطن سے بنتی ہیں محض خبریہ تھا' انشائیہ نہیں تھا'' ان کی تمام تر جلالت ِقدر' ان کے تقویٰ وتدینؒ اور مجاہدانہ سیرت وکردار کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ایک بالکل مہمل بات تھی' اس لیے کہ مولانا ایک سیاسی اور مذہبی قائد تھے اور اس اعتبار سے ان کی ہر بات میں ''انشائ'' اور مشورہ کا رنگ ہونا بالکل فطری امر تھا۔ اور علامہ اقبال کی تنقید بھی اصلاً مغرب کے اس نظریے ہی پر تھی کہ قوم وطن سے بنتی ہے (ملت کا لفظ تو غالباً صرف ضرورتِ شعری کے تحت استعمال ہو گیا تھا)۔ اور کفر اور شرک ایسے امراض ہر دور میں جو نئے لباس پہن کر اور نت نئے بھیس بدل کر اولادِ آدم کی گمراہی کے درپے ہوتے ہیں ان کی ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم !

کے انداز میں صحیح پہچان کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل ہوتا ہے جو اس دور میں مبدیٔ فیض سے علامہ اقبال کو عطا ہوا تھا ----- بقول خود ان کے کہ ؎

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ !

قصہ مختصر' ایک جانب سیکولرازم اور عوامی حاکمیت اور دوسری جانب وطنی قومیت کی پر زور نفی کی اساس پر علامہ اقبال نے تہذیبِ جدید اور مغربی تمدن کو نہ صرف چیلنج کیا بلکہ ''خبردار'' بھی کیا کہ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے وہ اب زرِ کم عیار ہو گا !

اور ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکُشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا !

اس مقام پر آگے بڑھنے سے قبل یہ جملۂ معترضہ عرض کیے بغیر نہیں رہا جا رہا کہ

''مسلم قومیت'' کی اساس پر وجود میں آنے والے ملک میں' جس کے لیے ساری سیاسی جنگ ''جداگانہ انتخابات'' کی بنیاد پر لڑی گئی تھی' پینتالیس سالہ تعطل کے نتیجے میں نظریاتی انحراف اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ملک کی ایک بڑی سیاسی جماعت یعنی پاکستان پیپلز پارٹی تو برملا ''مخلوط انتخابات'' کا نعرہ لگا رہی ہے' زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کے بھی بعض سیکولر مزاج کارکن اور رہنما کم از کم نظریاتی سطح پر اسی کے راگ میں اپنی راگنی شامل کر رہے ہیں' اور نوبت بایں جا رسید کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

اور ؎

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری !

کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ملک میں شناختی کارڈ میں ''مذہب'' کے خانے کے اندراج پر اس قدر شور اور ہنگامہ برپا ہوا ہے کہ مذہبی جماعتوں کو ایجی ٹیشن کی دھمکی دینی پڑ رہی ہے ! ----- رہا قائد اعظم مرحوم کا ۱۱ ؍ اگست ۱۹۴۷ء والا جملہ تو اسے ایک وقتی مصلحت کے طور پر قبول کرنا تو بالکل دوسری بات ہے ‘لیکن اگر مستقل فلسفے اور پاکستان کے دستور اور نظام کی مستقل اساس کے طور پر تسلیم کر لیا جائے تو یہ ''نظریۂ پاکستان'' کی صریح نفی اور مفکر و مصور پاکستان کے افکار ونظریات سے کھلی بغاوت ہے‘ جو نظریاتی سطح پر پاکستان کے جواز کے خاتمے اور‘خاکم بدہن‘ بالآخر عملی طور پر سوویت یونین کے مانند پاکستان کے بھی نیست ونابود ہونے پر منتج ہو گی ‘جبکہ پاکستان کی اس نظریاتی اساس کا استحکام اور اسی کی بنیاد پر ملک کے پورے دستوری اور قانونی نظام کی تشکیل عالم انسانیت میں ایک نئی تہذیب کے رواج‘ ایک نئے تمدن کے قیام وفروغ‘ اور اس ''نیو ورلڈ آرڈر'' کی بجائے جو حقیقت کے اعتبار سے ''جیو ورلڈ آرڈر'' یعنی یہود کی بالادستی کا نظام ہے‘ ایک حقیقی اور واقعی منصفانہ عالمی نظام (Just World Order) کے قیام کا نقطۂ آغاز

بن جائے گی۔ اور چونکہ یہی وہ چیز ہے جو ابلیس لعین اور اس کی تمام صلبی اور معنوی ذُرّیت (اولاد) اور یہود اور ان کے آلہ کار ''وہائٹ اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹس'' (WASP) کو نا پسند ہے‘ لہٰذا پاکستان میں اس منزلِ مقصود کی جانب کوئی چھوٹے سے چھوٹا‘ اور حقیر سے حقیر اقدام بھی ابلیس اور اس کے ملکی اور غیر ملکی کارندوں کو سخت ناگوار ہوتا ہے !

''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' نامی نظم حضرت علامہ نے ۱۹۳۶ء میں اپنے انتقال سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال قبل کہی تھی اور ان کے اردو کلام میں شعریت کے اعتبار سے تو بعض دوسری نظمیں اس کے مقابلے میں بہت بلند مرتبہ ومقام کی حامل ہیں‘ لیکن ''اُمت ِ مسلمہ کے نام پیغام'' کے اعتبار سے‘ اس میں ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ‘ اسی کو ان کے ''خاتمہ کلام'' اور ''پیامِ آخریں'' کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس کا ''حاصل کلام'' یا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ ابلیسیت کو کوئی خطرہ نہ جمہوریت سے ہے‘ نہ اشتراکیت سے بلکہ صرف اور صرف اسلام سے ہے۔ اس لیے کہ جہاں تک مغرب کی نام نہاد جمہوریت کا تعلق ہے وہ محض ''ملوکیت

کا اک پردہ'' ہے اور اس کی حقیقت ع ''چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر'' کے سوا اور کچھ نہیں (اس لیے کہ وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ''سرمایہ داروں کی آمریت'' ہے)۔ اسی طرح اشتراکیت بھی قدیم ''مزدکی منطق کی سوزن'' سے نوعِ انسان کے گریبانوں کے چاک کو رفو نہیں کر سکتی۔ بقول ابلیس ؎

لب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو!

لہٰذا ؎

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو!

اور ؎

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

اسلام سے اس خوف اور خطرے کے مقابلے میں ابلیس کو اگرچہ یہ تسلی اور اطمینان حاصل ہے کہ ایک جانب تو عمل کے اعتبار سے مسلمانوں کی حقیقی اور واقعی صورتِ حال یہ ہے کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں!

اور ؎

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

اور دوسری جانب نام نہاد ''اہل ایمان'' کے ایمان کی واقعی کیفیت یہ ہے کہ وہ ''یقین'' کی بجائے محض ایک ''عقیدہ'' بن کر رہ گیا ہے' یعنی ع

یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں !

اور ؎

زندہ قوت تھی زمانے میں یہ توحید کبھی
اور اب کیا ہے' فقط اک مسئلۂ علم کلام !

تاہم چونکہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ لا محالہ ''تلاشِ مصطفیٰ ؐ'' کی جانب ہے' لہٰذا ابلیس کو یہ اندیشہ بھی لاحق ہے کہ ؎

عصرِ حاضر کے تقاضائوں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں !

اور اس کے بعد کے چار اشعار تو نہ صرف یہ کہ اس طویل نظم کی اصل جان ہیں' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے نظام عدل اجتماعی یا نظام مصطفیٰ ﷺ کا جو فہم علامہ اقبال کو زندگی بھر کے مطالعے اور غور و فکر کے ذریعے حاصل ہوا تھا اس کی تعبیر کے ضمن میں ''سہلِ ممتنع'' کی بھی اعلیٰ ترین مثال ہیں اور ''جوامع الکلم'' کی بھی بہترین نظیر!

چنانچہ:

(۱) ؎

الحذر ! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر !
حافظ ناموسِ زن' مرد آزما' مرد آفریں

کی رو سے حضرت علامہ کے نزدیک اسلام کے سماجی اور معاشرتی نظام کی دو بنیادیں یہ ہیں کہ (i) اس میں عورتوں کی عصمت و عفت اور عزت و ناموس کی حفاظت کو اولین مقصد اور ہدف کی حیثیت حاصل ہے۔ اور (ii) اس میں مشکل اور مشقت طلب فرائض (جیسے طلبِ معاش اور دفاعِ ملک و ملت) کا بوجھ مرد پر ڈالا گیا ہے' عورت پر نہیں !

(۲) ؎

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں' نے گدائے رہ نشیں !

کے مطابق اسلام کا سیاسی نظام ''تمیزِ بندہ و آقا'' کے خاتمے کے اصول پر مبنی ہے' جس کی ایک ہی صورت ممکن ہے۔یعنی یہ کہ حاکمیت صرف اللہ کے لیے تسلیم کی جائے' بقول اقبال ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری !

اور تمام انسان حدیث نبویؐ میں وارد الفاظ ''کُونُوا عِبَادَ اللہِ اِخْوَانًا'' کے مطابق ایک جانب اللہ کے بندے اور دوسری جانب آپس میں بھائی بھائی بن جائیں --- اور صرف عقیدہ اور نظریہ کے علاوہ کوئی دوسری تمیز وتفریق اور اونچ نیچ انسانوں کے مابین باقی نہ رہے ! بفحوائے ؎

کلُّ مؤمِن اِخوۃٌ اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش

اور ؎

ناشکیب امتیازات آمدہ
در نہادِ اُو مساوات آمدہ !

جس کا منطقی نتیجہ ہے کہ اسلام روئے ارضی پر اللہ کی حاکمیت اور مسلمانوں کی خلافت کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے' گویا ؎

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر اُستوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر !

(۳' ۴) اقبال کی جامعیت کا نمایاں مظہر یہ بھی ہے کہ جہاں ما بعد الطبیعیات ان کا اصل موضوع تھا وہاں انہیں اقتصادیات سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ ان سے بڑھ کر کون اس حقیقت سے واقف ہو سکتا تھا کہ آج کی دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت معاشیات کو حاصل ہے اور آج کا انسان بالفعل ''معاشی حیوان'' بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن چار اشعار پر اس وقت گفتگو ہو رہی ہے' ان میں سے دو کا تعلق اسلام کے اقتصادی تصورات سے ہے۔ چنانچہ ایک جانب ''سرمایہ'' کے بارے میں فرمایا: ؎

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں !
اور دوسری جانب ''زمینداری'' کی جڑ یہ کہہ کر کاٹ دی کہ ؎
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں !

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام کے سماجی انصاف کے نظام کے ضمن میں علامہ اقبال نے توحیدِ الٰہی کے تینوں منطقی نتائج کو خود بھی کما حقہٗ سمجھا اور اللہ کے فضل وکرم سے انہیں اپنے اشعار کے ذریعے سمجھانے اور عام کرنے کا حق بھی پوری طرح ادا کر دیا۔ یعنی (i) چونکہ تمام انسان ایک ہی خالق کے پیدا کردہ (مزید برآں ایک ہی انسانی جوڑے کی نسل سے) ہیں لہٰذا ان کے مابین پیدائشی طور پر نسل' رنگ یا صنف کی بنا پر کوئی اونچ نیچ نہیں ہے' (ii) ''حاکمیتِ مطلقہ'' صرف اللہ کے لیے ہے اور انسانوں کے لیے محض ''خلافت'' ہے۔ (iii)''ملکیتِ تامہ'' بھی صرف اللہ ہی کے لیے ہے اور انسان کے لیے زمین سمیت کل مال و دولت صرف ''امانت'' کے حکم میں ہے۔ بقول شیخ سعدیؒ ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالک ہر شے خداست !

اور بقول اقبال ع
بندۂ مؤمن ایں' حق مالک است !

ان میں سے جہاں تک ''سیاستِ خلافت'' کا تعلق ہے' اس پر کچھ ہی دنوں قبل ان کالموں میں بھی مفصل گفتگو ہو چکی ہے' مزید برآں متعدد سیمینار بھی منعقد کیے جا چکے ہیں' لہٰذا اس کے بارے میں کسی مزید وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک معاشی عدل و انصاف کے ضمن میں اسلام کی تعلیمات کا تعلق ہے' اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ان کی حقیقت اور اہمیت جس شدت و حدت اور گہرائی و گیرائی کے ساتھ علامہ اقبال پر منکشف ہوئی اس کی کوئی مثال کم از کم انیسویں اور بیسویں صدی کے مفکرینِ اسلام اور داعیانِ دین میں سے کسی کے یہاں نہیں ملتی۔

چنانچہ یہ شعور و ادراک تو بحمد اللہ عام ہے کہ اسلام نے اپنے معاشی نظام میں ذاتی منفعت کے جبلی تقاضوں کو مناسب حد تک ملحوظ رکھ کر ''سرمایہ کاری'' کے لیے تو پوری فضا برقرار رکھی' لیکن ''سرمایہ داری'' کی لعنت کی جڑ سود کی حرمت کے ذریعے کاٹ کر رکھ دی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ''ربا'' کی خباثت و شناعت کے احساس و ادراک کے ضمن میں جس ''جوہر اندیشہ کی گرمی'' اقبال کے یہاں نظر آتی ہے وہ کم از کم راقم کی محدود معلومات کی حد تک کسی دوسرے مفکر یا عالم کے یہاں موجود نہیں ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں: ؎

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن !
کس نہ داند لذتِ قرضِ حسن

اور ؎

از ربا جاں تیرہ' دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ !

(اس ضمن میں احساس کی شدت اور حدت کے اعتبار سے اگر کوئی دوسرا شخص اقبال کے آس پاس نظر آیا تو وہ بھی حسن اتفاق سے ایک کشمیری شیخ ہی تھا' یعنی شیخ محمود احمد مرحوم جن کی مختصر کتاب ''سود کی متبادل اساس'' تو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شائع ہو چکی ہے' لیکن اصل معرکۃ الآراء تصنیف ''انسان اور سرمایہ'' (Man and Money) ابھی زیر طباعت ہے' لیکن صرف انگریزی میں !)

تاہم سود کی حرمت کے مسئلے پر تو پھر بھی غنیمت ہے کہ علماء دین کا اجماع ہے (اگرچہ دورِ ملوکیت میں پروان چڑھنے والی فقہ نے ''بیع مؤجل'' اور ''بیع مرابحہ'' کی اساس پر شرعی حیلوں کے ذریعے سود خوروں کے اطمینان و تسکین کا سامان فراہم کر رکھا ہے) لیکن ''زمین کے سود'' یعنی غیر حاضر زمینداری اور مزارعت کو تو امامِ اعظم حضرت ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ اور امام دار الہجرت حضرت مالک رحمہ اللہ علیہ کے فتوؤں کے علی الرغم تمام علمائے دین نے شیرِ مادر کی طرح حلال و طیب قرار دے رکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ علامہ اقبال کے ہاتھوں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کا نہایت اہم اور نمایاں مظہر ہے کہ اس مسئلے پر بھی انہوں نے نہایت واضح اور دو ٹوک بات کی۔ چنانچہ ایک جانب فلسفہ اور نظریہ کی سطح پر انہوں نے زمین کی ملکیت کی کلی نفی کی کہ ع

پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں !

اور ؎

دہ خدایا ! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں !

اور ؎

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ِملک خداست !

اور دوسری جانب عملی سطح پر امام اعظم اور امام دار الہجرت رحمہما اللہ کی آراء سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے حضرت علامہ نے زراعت میں مزارعت یعنی بٹائی کے نظام کو اللہ کی رحمت اور برکت سے محرومی کا سبب قرار دیا۔ بفحوائے: ؎

خدا آں ملتے را سروری داد
کہ تقدیرش بدست ِخویش بنوشت !
بہ آں قومے سروکارے نہ دارد
کہ دہقانش برائے دیگراں ِکشت !

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں تو ان کی شان بالکل 'منفرد'' ہے !

بہر حال، اسلام کے اس انقلابی فکر کی تجدید کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ علامہ اقبال نے ''انقلاب'' کا نعرہ بلند کیا اور اس کے لیے خاص طور پر سرمایہ داری، زینداری اور جاگیرداری ہی کے خلاف اعلان جہاد کیا ---- یعنی: ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ِناب
از جفائے دہ خدایاں کشت ِدہقاناں خراب
انقلاب ! انقلاب ! اے انقلاب ! ! !

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ حضرت علامہ نے اسلامی انقلاب کا ہدف معین کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو برپا کرنے کے منہج اور منہاج کو بھی کمال جامعیت اور غایت اختصار کے ساتھ واضح کر دیا۔ چنانچہ اس موضوع پر ان کا ایک شعر تو الہامی ہی نہیں ''معجزانہ'' ہے! تاہم اس کا ذکر بعد میں ہو گا۔ پہلے یہ بات واضح ہو جائے کہ علامہ کے نزدیک اسلامی انقلاب کی جد و جہد کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کو لوگوں کے ''اندر'' اُتارا جائے ‘جس سے ان کے ذہن و فکر‘ نظریات و خیالات‘ اہداف و مقاصد اور اقدار و ترجیحات میں ''انقلاب'' برپا ہو جائے۔ وہ ''اندر سے'' بالکل تبدیل ہو کر رہ جائیں۔ اس لیے کہ عالم انسانیت میں یہ باطنی اور نفسیاتی تبدیلی اور شخصی و انفرادی انقلاب ہی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ چنانچہ عظمتِ قرآن کے بیان میں فرماتے ہیں: ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

واضح رہے کہ اسی کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان کی آیت ۵۲ میں ''جہاد بالقرآن'' یعنی قرآن کے ذریعے جہاد سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

{فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾}

''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان کافروں کا کہنا نہ مانیں اور ان کے ساتھ جہاد جاری رکھیں اس (قرآن) کے ذریعے‘ پوری شدت اور قوت والا جہاد!''

اس لیے کہ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کی جدو جہد کے مرحلۂ اول یعنی دعوت و تبلیغ کا کل مبنیٰ و مدار اور مرکز و محور صرف اور صرف قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ اسی کے ذریعے وعظ و نصیحت‘ انذار و تبشیر اور تذکیر و تلقین‘ گویا فی الجملہ اسی کی تبلیغ و تعلیم اسلامی انقلابی جدو جہد کا پہلا مرحلہ ہے‘ لیکن یہ حقیقت کہ تزکیہ و تربیت کا آلہ اور ذریعہ بھی قرآن حکیم ہی ہے اور شیطانِ لعین اور اس کی صلبی اور معنوی اولاد کے مقابلے کے لیے بھی واحد تلوار اور ہتھیار اللہ کی کتاب ہی ہے‘ جس شدت کے ساتھ اقبال پر منکشف ہوئی اور جس قدر وضاحت کے ساتھ انہوں نے اسے بیان کیا اس کی بھی کوئی دوسری مثال کم از کم راقم کے علم میں موجود نہیں ہے! (اس موضوع پر بھی چونکہ ان کالموں میں مفصل گفتگو ہو چکی ہے‘ لہٰذا تفصیل کی ضرورت نہیں ہے!) ----- ان کے ساتھ دو مراحل کا مزید اضافہ کر لیا جائے یعنی ایک تنظیم جس پر گفتگو ہو چکی ہے‘ اور دوسرے صبرِ محض یا عدمِ تشدد یا صحیح تر الفاظ میں ''عدمِ انتقام'' جس پر گفتگو ابھی باقی ہے‘ تو علامہ اقبال کے متذکرۂ صدر ''معجزانہ'' شعر کا مصرعہ اول مکمل ہو جاتا ہے‘ یعنی:ع

''با نشۂ درویشی در ساز و دما دم زن !''

اس لیے کہ ان چار مراحل کے دوران اسلامی انقلاب کے لیے کوشاں کارکنوں اور مجاہدوں کا نقشہ واقعی طور پر اور لا محالہ بدھ مت کے بھکشوئوں' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں ہی سے مشابہ ہوتا ہے۔ یعنی گالیاں سنو اور دعائیں دو' پتھر کھائو اور پھول پیش کرو' سائلوں کی طرح دعوت دو' بھکاریوں کی طرح در در کی ٹھوکریں کھائو' اور اُف تک نہ کرو' بلکہ صبر کرو اور اپنی جدو جہد کو ''دما دم زن'' کے انداز میں جاری رکھو ! چنانچہ مکی دور کے بارہ سالوں کے دوران مسلسل یہی ہدایات اللہ تعالیٰ کی جانب سے محمد رسول اللہ ﷺ کو' اور آنحضور ﷺ کی جانب سے صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کو ملتی رہیں کہ:

{وَ لِرَبِّکَ فَاصۡبِرۡ ﴿۷﴾} (المدثر)

''اور اپنے رب (کی خوشنودگی) کے لیے صبر کرو !''

اور

{وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ﴿۹۷﴾} (الحجر)

''ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے۔''

لیکن اس کے باوجود

{وَ اصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ اہۡجُرۡہُمۡ ہَجۡرًا جَمِیۡلًا ﴿۱۰﴾} (المزمل)

''صبر کرو اس پر جو یہ کہہ رہے ہیں اور ان سے کنارہ کشی بھی کرو تو خوبصورتی کے ساتھ۔''

اور

{فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَ لَا تَکُنۡ کَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ ۘ} (القلم: ۴۸)

''صبر کے ساتھ انتظار کرو اپنے رب کے حکم کا اور مت ہو جائو اس مچھلی والے (حضرت یونس ؑ) کی مانند (جنہوں نے عجلت سے کام لیا تھا)۔''

اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ شریعت کے مستقل اور ابدی قانون سے حکمِ قصاص ساقط ہو گیا تھا یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طبع بشری بدل گئی تھی اور اس میں جوشِ انتقام پیدا ہی نہیں ہوتا تھا' بلکہ یہ صرف انقلابی جدو جہد کے ابتدائی مراحل کا وقتی تقاضا تھا۔ چنانچہ خود سورۃ الشوریٰ میں جو مکی دور کے بھی وسط میں نازل ہوئی تھی' اہل ایمان کا یہ وصف مقامِ مدح میں مذکور ہے کہ:

{وَ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَہُمُ الۡبَغۡیُ ہُمۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾ وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُہَا ۚ}

''اور وہ کہ جن پر زیادتی کی جائے تو وہ بدلہ لیتے ہیں ! اور برائی کا بدلہ تو یقیناً ویسی ہی برائی ہے !''
تاہم یہ {کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ} ''اپنے ہاتھ روکے رکھو'' (سورۃ النسائ: ۷۷) کا وقتی حکم کچھ ایسی کیفیت کے ساتھ تھا کہ ؎

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی !

اس لیے کہ جیسے ہی یثرب کی جانب ہجرت ہوئی اور فضل خداوندی سے آنحضور ﷺ کی انقلابی جدو جہد کو ''اقدام اور چیلنج'' کے لیے مرکز اور قاعدہ (مورچہ) میسر آگیا' اہل

28

ایمان کے ہاتھ کھول دیے گئے اور اذنِ قتال نازل ہو گیا ۔یعنی:
{اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّہُمْ ظُلِمُوْا ط} (الحج: ۳۹)
''اجازت دے دی گئی انہیں جو جنگ کر رہے ہیں (یا اختلافِ قراءت کی بنا پر: جن پر جنگ مسلط کر دی گئی ہے !) اس لیے کہ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے !''
پھر جب اس کے نتیجے میں کچھ ہی دنوں بعد مسلح تصادم اور قتال فی سبیل اللہ کا آخری مرحلہ شروع ہو گیا تو اولاً سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹۳ میں اور پھر مزید وضاحت اور صراحت کے ساتھ سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ میں حکم دے دیا گیا کہ ''ان (کافروں) سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کل اللہ ہی کے لیے ہوجائے !'' ----- یعنی اللہ کی زمین سے باطل کی حکمرانی کا قلع قمع ہو جائے اور اس کے باغیوں اور سرکشوں کی حکومتوں کے تختے الٹ دیے جائیں اور ''حق بحقدار رسید'' کے مصداق اللہ کی زمین پر اللہ ہی کی حکومت (یا انجیل کی اصطلاح میں ''آسمانی بادشاہت'') قائم ہو جائے۔
چنانچہ اقدام اور چیلنج اور مسلح یا غیر مسلح تصادم کے ان مراحل کو اقبال نے کمالِ جامعیت و اختصار اور معجزانہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ سمو دیا اپنے متذکرہ بالا شعر کے دوسرے مصرعے میں۔ یعنی: ع

''چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن !''

اور اسی کے لیے وہ مسلسل پکارتے' ابھارتے اور للکارتے رہے امت مسلمہ بالخصوص اس کی ''مذہبی قیادت'' کو 'جو مدرسہ اور خانقاہ یا علماء اور صوفیاء میں منقسم تھی اور جس کے بارے میں ان کے مشاہدات اور تاثرات کا اظہار ان کے ان الفاظ کے ذریعے بخوبی ہوجاتا ہے کہ ع ''اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک !'' ----یہی وجہ ہے کہ

اگرچہ انہوں نے ایک جانب اس وجودی تصوف کی شدت کے ساتھ مخالفت کی جس کے زیر اثر خام طبائع میں عمل‘ اقدام اور جہاد کی بجائے تعطل‘ گریز اور جمود کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں‘ اور نہ صرف یہ کہ اہل تصوف کو زور دار دعوت دی کہ ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؓ
کہ رسم خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری !

بلکہ یہ بھی بتایا کہ یہ تو مسلمانوں کے بارے میں ابلیس لعین کی اپنے کارندوں کو اہم ہدایت ہے کہ ؎
مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے !

اور دوسری طرف علماء دین کو بھی جھنجوڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ چنانچہ ان کے جو شاہکار اشعار ان کے مرقد کی زینت بنے ہوئے ہیں ان میں یہ قطعہ بھی شامل ہے کہ ؎
یا تا کارِ ایں امت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم

اور ؎
چناں نالیم اندر مسجد شہر
دلے در سینۂ مُلّا گدازیم !

تاہم ان کا اصل خطاب مسلمانانِ ہند کی جدید تعلیم یافتہ نوجوان نسل سے تھا ‘جس کے دلوں کو انہوں نے کبھی تو عظمت رفتہ اور سطوتِ گزشتہ کی یاد سے گرمانے کی کوشش بھی کی کہ ؎
کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا !

اور کبھی ان کے جوشِ عمل کو مستقبل کے بارے میں امید افزا پیشین گوئیوں اور مغرب کے زوال اور اسلام کے عروج کی ع ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید!'' کے سے انداز کی خبروں کے ذریعے ابھارا۔ جیسے ؎

کتابِ ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اور ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کی اس ملی شاعری نے مسلمانانِ ہند کے نوجوان طبقے کے دلوں سے اس یاس اور نا امیدی کے اندھیاروں کو کافور کر دیا جس کا نمایاں ترین مظہر قومی شاعر ہونے کے اعتبار سے علامہ کے پیشرو مولانا حالی کی شہرۂ آفاق مسدس کی ابتدا اور اختتام کے یہ دلدوز اشعار ہیں ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے!
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

اور ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسلؐ وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے!
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

بایں ہمہ یہ واقعہ اپنی جگہ نا قابل انکار ہے کہ علامہ اقبال نے اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کے اس عظیم الشان کارنامے' انقلاب کے منہج اور منہاج کی واضح نشاندہی کی عظیم خدمت اور مسلمانانِ ہند کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے طبقے میں ایک جذبۂ عمل پیدا کرنے کی بھرپور سعی کے باوجود خود نہ کسی احیائی تحریک کا آغاز کیا' نہ ہی کسی جماعت کی تاسیس کی۔ اسی بنا پر ہم نے اس سے قبل انہیں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ علیہ سے مشابہ قرار دیا تھا' جو اگرچہ خود تو آخر وقت تک صرف ایک گوشہ نشین درویش اور معلم و مصنف ہی رہے لیکن انہوں نے ایک جانب مسلمانانِ ہند کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لیے افغانستان

سے احمد شاہ ابدالی کو بلایا' اور دوسری جانب صحیح علم و عمل کی وہ فضا پیدا کر دی جس کے نتیجے میں دوسری ہی نسل میں سید احمد بریلوی رحمہ اللہ علیہ کی قیادت و امارت اور شاہ ولی اللہؒ کے پوتے شاہ اسماعیل رحمہ اللہ علیہ کی معاونت و مبایعت سے تحریک ِمجاہدین ایسی عظیم تحریک برپا ہوگئی۔ عجیب حسن اتفاق ہے کہ بالکل اسی طرح علامہ مرحوم نے بھی مسلمانانِ ہند کی قومی جدو جہد کی کشتی کی ناخدائی کے لیے بلایا قائد اعظم محمد علی جناح کو انگلستان سے' اور خود اپنی بھی عملی سرگرمی کو اسی قومی دائرے میں محدود رکھا ----- لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ان ہی کی ''تجدید فکر اسلامی'' تھی جس کے نتیجے میں اولاً مولانا ابو الکلام آزاد نے ''حکومت ِالٰہیہ'' کا نعرہ لگایا اور ''حزب اللہ'' قائم کی اور بعد ازاں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی میدان میں اترے' جنہیں حضرت علامہ ہی نے پنجاب نقل مکانی کی دعوت دی' جہاں کی فضا علامہ کی ملی شاعری کے ذریعے بہت ہموار اور سازگار ہو چکی تھی۔

* * *

باب دوم

فکر اقبال کی تعمیل
کا تاریخی جائزہ

سب جانتے ہیں کہ انقلابِ فرانس کو فکری غذا والٹیئر' روسو اور بعض دیگر مصنفین نے فراہم کی تھی' تاہم انقلاب کی قیادت تو کجا' اس کی عملی جدو جہد میں بھی ان میں سے کسی کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اسی طرح انقلابِ روس کے لیے فکری مواد مارکس اور اینجلز نے جرمنی اور انگلستان میں بیٹھ کر تیار کیا تھا' تاہم نہ صرف یہ کہ ان میں سے کوئی بھی مردِ میدان نہ تھا' بلکہ ان دونوں ملکوں میں تو کمیونسٹ انقلاب کی کوئی آواز کبھی بلند ہی نہ ہو سکی اور اشتراکی انقلاب بالفعل روس میں بالشویک اور مانشویک لوگوں کی جدو جہد اور لینن کی اتفاقیہ قیادت کے ذریعے برپا ہوا ----- خود مسلمانوں کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ دورِ صحابہؓ کے بعد' سوائے ایک امام ابن تیمیہؒ کے' جتنے لوگ علم و فکر اور قلم و قرطاس کے میدان میں نمایاں ہوئے ان میں سے کوئی بھی سیف وسناں کا حامل نہ ہوا۔ چنانچہ دوسری صدی ہجری کے مجددِ اعظم امام ابو حنیفہؒ نے بھی اگرچہ حضرت نفس زکیہؒ کی اخلاقی تائید بھی کی اور ان کے ساتھ مالی تعاون بھی کیا لیکن عملاً جہاد و قتال میں شرکت نہیں کی۔ اسی طرح اُمت کی تاریخ کے دوسرے ہزار سالہ دور (الف ثانی) کے آغاز پر دو عظیم ترین مجددوں یعنی شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مساعی بھی صرف قلم و قرطاس کی خدمت یا باطنی اور روحانی اصلاح تک محدود رہیں۔

علیٰ ہٰذا القیاس' اگر علامہ اقبال مرحوم نے بھی صرف اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کا کارنامہ سر انجام دیا اور خود عملی طور پر نہ کسی تحریک کا آغاز کیا نہ کسی جماعت کی تاسیس کی تو

اس میں ہرگز نہ کوئی تعجب کی بات ہے' نہ ہی اس سے ان کی ذات اور شخصیت پر کوئی حرف آتا ہے۔ اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح گزشتہ صدی کی عظیم تحریک مجاہدینؒ فی الواقع شاہ ولی اللہؒ ہی کی تجدیدی مساعی کا ظہور تھی' اسی طرح اگر ذرا بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ بیسویں صدی عیسوی کی جملہ احیائی مساعی کی بنیاد میں بھی علامہ اقبال ہی کا فکر کار فرما ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہوا اور سلطنت خداداد پاکستان اسلام کی ''نشأۃ ثانیہ'' کا گہوارہ اور عالمی نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نقطۂ آغاز بنی' اور اس کے لیے یہاں منہجِ نبویؐ پر کوئی انقلاب برپا ہوا' جس کے تاریخی شواہد بہت قوی ہیں (اگرچہ موجود الوقت احوال و کیفیات کی بنا پر گاہ بگاہ مایوسی اور بد دلی کے آثار بھی پیدا ہوجاتے ہیں!) تو اس کی اصل اساس علامہ اقبال کے اسی ''کارنامے'' پر ہو گی جو انہوں نے اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کی صورت میسر انجام دیا ----- تاہم اس حقیقت کے کما حقہ ادراک کے لیے ضروری ہے کہ پہلے علامہ مرحوم کی شخصیت کو تاریخ کے فریم میں فٹ کر لیا جائے

* * *

علامہ اقبال کی ولادت ۱۸۷۷ء میں اسی سال ہوئی جس سال مسلم انڈیا میں ایک نئی فکری اور سیاسی روایت کے بانی اور موجد سر سید احمد خان کے ہاتھوں ایم اے او کالج علی گڑھ کی تاسیس ہوئی (اس سے قبل سر سید مرحوم علی گڑھ ہی میں ۱۸۲۶ء میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' اور ۱۸۷۵ء میں ایم اے او ہائی اسکول قائم کر چکے تھے)۔ پھر علامہ کی شاعری کا آغاز لگ بھگ اُس وقت ہوا جب سر سید کی زندگی کا چراغ گل ہوا ہی چاہتا تھا۔ سر سید کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا اور علامہ اقبال اگرچہ لاہور کے حلقۂ شعر و ادب میں تو ۱۸۹۵ء ہی سے متعارف ہو چکے تھے ‘تاہم ان کی وہ پہلی نظم جس کے ذریعے وہ ہندوستان کے وسیع تر علمی و ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے ''ہمالہ'' ہے جو اپریل ۱۹۰۱ء میں آنریبل سر عبد القادر کے جاری کردہ ماہنامے ''مخزن'' کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں علامہ کا پہلا اردو مجموعہ کلام ''بانگ ِدرا'' شائع ہوا تو اس کا دیباچہ بھی ان ہی

سر عبد القادر نے لکھا ‘جس میں انہوں نے علامہ کی شاعری کو بجا طور پر تین ادوار میں منقسم قرار دیا۔ (واضح رہے کہ ''بانگ درا'' سے قبل علامہ کے فارسی کلام پر مشتمل تین کتابیں شائع ہو چکی تھیں‘ یعنی ----- اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء میں‘ رموزِ بیخودی ۱۹۱۸ء میں‘ اور پیامِ مشرق ۱۹۲۳ء میں!)

علامہ کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۵ء تک ہے ‘جس میں وہ زیادہ تر حالی کی ''نیچرل شاعری'' کے انداز میں انگریزی شعراء کا اتباع کرتے اور ہندی قومیت کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ دوسرے دور (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ئ) میں وہ اردو اور فارسی شاعری کے روایتی مضامین یعنی گل و بلبل‘ حسن و عشق‘ فراق و وصال کی دشت پیمائی کرتے نظر آتے ہیں ----- لیکن ۱۹۰۸ء میں جیسے ہی ان کی حیاتِ مستعار کی چوتھی دہائی کا آغاز ہوتا ہے‘ ان کی ''ملی شاعری'' کا دور بھی بھرپور انداز میں شروع ہو جاتا ہے۔ اب وہ مسلمانوں کی وحدتِ ملی کے ترانے گاتے‘ اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر آنسو بہاتے‘ لیکن ساتھ ہی ان دونوں کے احیاء اور عروجِ نو کی نوید ِجان فزا سناتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے پہلی دونوں حیثیتوں میں وہ شبلی اور حالی کی روایت کے تسلسل کی حیثیت رکھتے ہیں (جو خود اپنی جگہ آسمانِ سر سید ہی کے ستارے تھے)۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۴ء میں حالی کے انتقال پر انہوں نے کہا: ؎

خاموش ہو گئے چمنستاں کے رازدار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد!

اور ؎

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد !

لیکن تیسری حیثیت میں‘ یعنی اسلام کے احیاء و تجدید کے علمبردار اور مسلمانوں کے عروجِ نو کے بشر اور نقیب ہونے کے اعتبار سے وہ بالکل ''منفرد'' بھی ہیں اور ایک نئے دور کے ''فاتح'' یعنی افتتاح کرنے والے بھی !

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے‘ وہ بنیادی طور پر ''مردِ میدان'' نہیں بلکہ ایک مفکر و مصور اور حکیم و دانا انسان تھے‘ لہٰذا فکر اور فلسفہ کی سطح پر انہوں نے جن بلندیوں کو چھوا‘ (اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ جو شعر انہوں نے غالب کے بارے میں کہا تھا اس کے مصداقِ کامل و اَتم وہ خود ہیں ----- یعنی: ''فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا‘ ہے پر مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا !'') اور جس وسعتِ نظر کا ثبوت دیا‘ اور اس سے بھی بڑھ کر ''آنے والے دَور کی دھندلی سی اِک تصویر'' نہ صرف خود دیکھی بلکہ دوسروں کو بھی دکھائی‘ اس کے مقابلے میں عمل کے میدان میں ان کا مقام زیادہ بلند اور نمایاں نظر نہیں آتا (بقول خود ان کے کہ ع ''گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا !'')۔ تاہم انہوں نے مسلمانانِ ہند کو اپنے جداگانہ قومی تشخص کا احساس و شعور عطا کرنے میں جو عظیم کامیابی حاصل کی (اس اعتبار سے راقم الحروف کے نزدیک وہ مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے ظل اور بروز کی حیثیت رکھتے ہیں) اور اس سے بھی بڑھ کر ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد کے ذریعے ان کی قومی جدو جہد کے لیے جو منزلِ مقصود اور نصب ‘العین معین کیا‘ اور ان سب پر مستزاد مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں جس طرح ایک عام کارکن کی طرح حصہ لیا‘ اس کے پیش نظر وہ عمل کے میدان میں بھی بالکل خالی ہاتھ نہیں ہیں اور پاکستان کے قیام میں ان کا حصہ کسی دوسرے قائد سے ہرگز کم نہیں ہے !

لیکن دوسری جانب احیائِ دین اور ''طلوعِ اسلام'' کا جو زبردست صور انہوں نے پھونکا تھا‘ بر عظیم پاک و ہند کی پوری اسلامی تحریک فی الحقیقت اسی کی مرہونِ منت ہے اور خود اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی !

بیسویں صدی عیسوی میں بر عظیم پاک و ہند میں احیاء اسلام کا جو غلغلہ بلند ہوا وہ سب اسی مردِ درویش کا فیض ہے جسے ہم اوپر حضرت مجددؒ کا ظل قرار دے چکے ہیں۔

* * *

تجدید و احیائے دین کے عملی میدان میں اگرچہ آغاز میں سر سید مرحوم کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے متعدد اہم اشخاص ''حکومت ِالٰہیہ'' کے زور دار نعرے کے ساتھ اُترے ،لیکن کچھ حالات کی نا موافقت اور کچھ اپنی استقامت کی کمی کے باعث سب کے سب ناکام ہو گئے۔ چنانچہ ان میں سے بعض تو فوراً ہی منظر سے غائب ہو گئے، جیسے خیری برادران، اور بعض نے اپنے جوش و جذبے اور تنظیمی و عسکری صلاحیت کی بنا پر کچھ عرصے کے لیے بڑا سماں باندھا، جیسے علامہ مشرقی، لیکن وہ واحد شخصیت جس سے ایک ایسی نئی روایت کا آغاز ہوا ،جس کا تسلسل خود اس کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد بھی قائم رہا، مولانا ابو الکلام آزاد کی تھی، اگرچہ یہ نہ خود انہوں نے کبھی تسلیم کیا نہ ان کا کوئی عقیدت مند آج تسلیم کرے گا کہ انہوں نے کوئی اثر علامہ اقبال سے قبول کیا تھا، لیکن اگر ذرا شخصی محبت و عقیدت کے پردے ہٹا کر حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھا جائے، اور زمان و مکان کے نا قابل تردید حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو صاف محسوس ہو گا کہ ۱۹۰۸ء میں جب اقبال کی ملی شاعری کا ڈنکا بجنا شروع ہوا ،احمد المکنی بابی الکلام کی عمر کل بیس برس تھی۔ گویا یہ اس ذہین اور طباع نوجوان کی زندگی کا سب سے زیادہ حساس اور اخاذ دور تھا، تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے ذہن و فکر کی تشکیل میں اس ''بانگ ِدرا'' اور ''بانگ ِرحیل'' کا کوئی حصہ نہ ہو جو اقبال کی ملی شاعری کی صورت میں بر عظیم کے پورے طول و عرض میں گونج رہی تھی، خصوصاً جبکہ اس کی ابتدائی تربیت میں مؤثر حد تک عمل دخل آسمانِ سر سید کے ایک ٹوٹے ہوئے تارے علامہ شبلی کو بھی حاصل تھا!

بہر حال اس وقت نہ اس پر زیادہ بحث کا موقع ہے کہ مولانا آزاد کے قلب و ذہن میں احیاء اسلام کا جذبہ و ارادہ علامہ اقبال کی ملی شاعری کے زیر اثر پیدا ہوا تھا ،یا یہ براہ ،راست ع ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں!'' کی صورت تھی ،یا پھر ''توارد ِباہمی'' والا معاملہ تھا۔ اس وقت جس حقیقت کی جانب توجہ دلانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے ابو الکلام کی شخصیت اور کارنامے کو اگر دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے تو ان میں سے ایک کو تو ان کے اور علامہ اقبال کے مابین قدرِ مشترک کی

حیثیت حاصل ہے اور فرق صرف اسلوب اور انداز کا ہے' البتہ دوسرا حصہ کم از کم ظاہری اور عملی اعتبار سے قدرے مختلف اور' جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا' ایک نئی روایت کے نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان میں سے مقدم الذکر حصہ یعنی امت مسلمہ کی زبوں حالی اور اولاً جنگ بلقان اور پھر پہلی عالمگیر جنگ کے دوران مسلمانوں پر دُوَلِ یورپ کے مظالم پر مرثیہ خوانی' اور عظمت قرآن کے بیان اور اس کی جانب مؤثر اور زور دار دعوت کو علامہ اقبال اور مولانا آزاد کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں سے بھی ظاہر ہے کہ احیائِ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے زیادہ اہمیت دوسری بات کی ہے' اور اس کے ضمن میں ان دونوں کے مابین ایک اعتبار سے تو صرف اسلوب اور انداز کا فرق ہے' یعنی جہاں اقبال نے قرآن کو اپنے اشعار میں ''سمو'' دیا' وہاں آزاد نے اسے اپنی نثر کی روحِ رواں بنا دیا۔ (واقعہ یہ ہے کہ اسی سے آزاد کی نثر کو یہ حیثیت حاصل ہوئی کہ حسرت موہانی ایسا شخص پکار اٹھا کہ ے ''جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر' نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا!'') اسی طرح جہاں اقبال کے یہاں ''فکر'' کا پلڑا بھاری رہا وہاں آزاد کے یہاں ''دعوت'' کا انداز غالب ہے ----- البتہ ایک دوسرے پہلو سے راقم اپنا یہ تاثر بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ''عظمت قرآن'' کے انکشاف کی جو شدت وحدت اور گہرائی و گیرائی اقبال کے یہاں نظر آتی ہے اس کی دوسری مثال کم از کم راقم کے علم میں نہیں ہے۔

* * *

البتہ مولانا ابو الکلام آزاد کی زندگی کے متذکرہ بالا آٹھ سالہ دور کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ ''منفرد'' ہیں۔ یعنی اقبال نے اللہ کی حاکمیت اور ''نورِ توحید کے اتمام'' کا جو نعرہ لگایا اور ملت بیضا کی از سر نو ''شیرازہ بندی'' اور ع ''یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!'' کی جو نوید جان فزا سنائی' اس کے لیے عملی جدو جہد کے ضمن میں ''راست اقدام'' کے ناگزیر تقاضوں کی تعمیل اور تکمیل کی جانب توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ پہلا عملی قدم ابوالکلام نے اٹھایا۔

اس سلسلے میں انہوں نے جہاں فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت' حکومت الٰہیہ اور خلافت اسلامیہ کے قیام کی فرضیت' اور اس کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کے لزوم کو اپنی تحریر اور تقریر کے اہم موضوعات کی حیثیت دی وہاں' واقعہ یہ ہے کہ' دو عظیم حقیقتوں کی جانب مسلمانوں کی توجہ مبذول کرانا تو ان کا پوری

امت ِمسلمہ پر بالعموم اور حال اور مستقبل کی تمام احیائی تحریکوں پر بالخصوص عظیم احسان ہے۔ یعنی (۱) یہ کام ایک منظم اور سمع وطاعت کی خوگر جماعت کے قیام کے بغیر ناممکن ہیں' اور (۲) مستقبل کا ''اسلامی انقلاب'' بھی صرف اسی طریقہ کار پر عمل پیرا ہو کر برپا کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعے چودہ سو سال قبل نبی اکرم ﷺ نے یہ انقلاب جزیرہ نمائے عرب میں برپا کیا تھا!

ان میں سے پہلی بات کے لیے تو انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارک کا حوالہ دیا جو مشکوٰۃ شریف میں مسند احمدؒ اور جامع ترمذیؒ کے حوالے اور حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے موجود ہے' یعنی: آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں (ایک روایت میں یہ اضافی الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: ''مجھے ان کا حکم اللہ نے دیا ہے'') یعنی جماعت کا حکم' سننے کا حکم' اطاعت کا حکم' ہجرت کا حکم' اور جہاد فی سبیل اللہ کا حکم!'' ان پانچ باتوں کا تعلق اسلامی حکومت یا نظام خلافت کے ساتھ تو اظہر من الشمس ہے۔ یعنی اگر اسلامی حکومت یا نظامِ خلافت قائم ہو تو ان پانچوں احکام پر عمل لازمی طور پر خود بخود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک عالم اسلام میں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں (خواہ ملوکیت ہی کی صورت میں) قائم رہیں ان پانچ احکام کا حوالہ بھی کسی نہ کسی درجہ اور حیثیت میں برقرار رہا۔ لیکن جب مسلمان ممالک پر غیر مسلم اقوام کی حکومتیں قائم ہو گئیں تو یہ پانچوں احکام بھی غیر متعلق اور رفتہ رفتہ ''آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل'' کے مصداق ذہن سے محو ہوتے چلے گئے۔ کسی کو یہ خیال ہی نہ آیا کہ اس حدیث مبارک میں اسلامی حکومت یا نظام خلافت کے از سر نو قیام کی جدو جہد کے ضمن میں بھی بنیادی رہنمائی موجود ہے --- چنانچہ جب ۱۹۱۲ء میں یہ حدیث ''الہلال'' میں شائع ہوئی تو بہت سے مسلمان چونک گئے اور انہیں گویا اپنا بھولا ہوا سبق یاد آگیا۔ بہر حال مولانا آزاد نے

مسلمانانِ ہند کو اس حدیث مبارک کی جانب صرف متوجہ ہی نہیں کیا بلکہ ۱۹۱۳ء میں اسی پر عمل کرتے ہوئے بیعت کی اساس پر ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک جماعت بھی قائم کر دی۔

دوسری بات کے لیے مولانا آزاد نے اولاً ۱۹۱۲ء ہی میں امامِ دار الہجرۃ حضرت مالک بن انس رحمہ اللہ علیہ کے اس قول کا حوالہ دیا کہ: ''اس امت کے آخری حصے کی اصلاح ہرگز نہ ہو سکے گی مگر صرف اسی طریق پر جس پر پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی'' ----- اور پھر دوبارہ لگ بھگ دس سال بعد نومبر ۱۹۲۱ء میں جمعیت علماء ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں اپنے تحریری خطبے میں اس کا حوالہ دیا۔ اب (۱۹۹۲ئ) سے تقریباً دس سال قبل جب ''منہج انقلابِ نبویؐ'' راقم کی تحریر اور تقریر کا خاص موضوع بنا تو اس کے ضمن میں مولانا آزاد کے حوالے سے امام مالکؒ کا یہ قول بھی بہت نقل ہوا۔ اس پر بعض بزرگوں نے توجہ دلائی کہ اس قول مبارک کی حیثیت بھی حدیث کی ہے۔ اس لیے کہ یہ اصلاً حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس خطبے میں وارد ہوا ہے

جو انہوں نے اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایام میں ارشاد فرمایا تھا اور جس کے ذریعے خلافت کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نامزدگی ہوئی تھی۔

* * *

الغرض، میرے نزدیک ۱۹۱۳ء میں ''حزب اللہ'' کا قیام علامہ اقبال کے انقلابی فکر کی تعمیل کی جانب پہلا قدم تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مولانا آزاد اس پر صرف آٹھ سال تک استقامت کا مظاہرہ کر سکے اور انہوں نے خود اپنے قول کے مطابق ان علماء کی مخالفت کے باعث پٹڑی تبدیل کر لی جن کے دینی تصورات بارہ سو سالہ زوال و انحطاط کے باعث صرف عبادات و رسومات اور اس سے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ نکاح و طلاق اور میراث کے مسائل تک محدود ہو کر رہ گئے تھے ----- چنانچہ اپنے ایک سرگرم رفیق اور جان نثار ساتھی مولانا محی الدین قصوری مرحوم کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''میں اپنے پندرہ سال کے طلب و عشق کے بعد وقت کے عدم مساعدت و استعداد کا اعتراف کرتا ہوں ... میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ موجودہ طبقہ علماء سے میں بالکل

مایوس ہوں اور اس کو قوانین اجتماعی کے خلاف سمجھتا ہوں کہ ان کے جمود میں کسی قسم کا تقلب و تحول پیدا ہو ...'' لیکن بعض دوسرے حضرات (جن میں ان کے بعض عقیدت مند ہی نہیں بیعت کرنے والے بھی شامل ہیں) کے نزدیک اس کا اصل سبب مولانا کی اپنی کم ہمتی تھی۔ یہاں تک کہ ان کے ایک دوسرے مخلص رفیق اور مولانا محی الدین قصوری ہی کے برادر اصغر مولانا محمد علی قصوری نے یہ الفاظ تک لکھ دیے کہ: ''... لیکن عین وقت پر مولانا آزاد کی بزدلی نے تمام کھیل بگاڑ دیا اور وہ سارے کا سارا محل جس کی تعمیر پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا تھا اور سینکڑوں مسلمانوں نے اسے اپنے خون سے سینچا تھا، مولانا کی گریز پائی کی وجہ سے آن کی آن میں دھڑام سے نیچے آن گرا''۔ (ان دونوں حوالوں کے لیے دیکھئے: ''تحریک نظم جماعت'' تالیف ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری، صفحات ۱۰۱، ۱۰۴ اور ۱۰۵) ---- بہر حال جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اس بحث کے فیصلے کی تو نہ گنجائش ہے نہ ضرورت --- - اصل بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کے انقلابی فکر کی تعمیل کے لیے ''راست اقدام'' کی سعی اول ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ختم ہو گئی، لیکن اس فکر کی روح باطنی اور قوتِ متحرکہ نے بہت جلد مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی صورت میں نیا پیکر تلاش کر لیا جن کے فکر اقبال سے اثر پذیر ہونے کا معاملہ ویسے بھی اظہر من الشمس ہے۔ مزید برآں اس کا یہ تاریخی ثبوت تو نا قابل تردید ہے ہی کہ انہیں علامہ اقبال نے جنوبی ہند سے شمالی ہند نقل مکانی کی صرف دعوت ہی نہیں دی تھی، اس سلسلے میں ان کے ساتھ عملی تعاون بھی کیا تھا۔

* * *

یہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ اگرچہ بیسویں صدی عیسوی میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید اور احیاء کا سہرا تمام تر علامہ اقبال کے سر ہے' تاہم انہوں نے اپنی عملی مساعی کو صرف مسلمانانِ ہند کی اس قومی تحریک کی تائید اور تقویت تک محدود رکھا جو سر سید احمد خان مرحوم کے مکتب فکر کے تحت شروع ہوئی تھی 'اور خود اسلام کے احیاء اور غلبے کی براہِ راست جدو جہد کے لیے نہ کسی تحریک کا آغاز کیا نہ کوئی جماعت بنائی۔ البتہ اس

حقیقت کو نگاہوں سے ہرگز اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے کہ حضرت علامہ نے اپنے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی متذکرہ بالا قومی تحریک کو ایک معین سمت اور واضح منزل کا شعور عطا کر کے اس میں صرف نظریاتی ہی نہیں ''احیائی'' رنگ کی آمیزش بھی کر دی تھی۔ چنانچہ اپنے اس تاریخ ساز خطبے میں انہوں نے جہاں مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کا مدلل اور فلسفیانہ انداز میں اثبات کیا' اور یہ پیشین گوئی بھی کی کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام ''تقدیر الٰہی'' ہے' وہاں یہ فرما کر کہ: ''اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کے چہرۂ روشن پر جو تاریک پردے عرب ملوکیت کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر عالم انسانیت کو اس کی اصل تعلیمات سے روشناس کرا سکیں!'' خلافت ِراشدہ یا ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کے قیام کو مسلمانانِ ہند کی قومی جدو جہد کا نصب العین قرار دے دیا تھا' اس لیے کہ دور ملوکیت سے قبل کا اسلام' ظاہر ہے کہ' دورِ نبوت اور خلافت ِراشدہ کا اسلام ہی تھا۔ چنانچہ کون نہیں جانتا کہ بعد میں یہی نظریاتی اپیل اور احیائی جذبہ مسلمانانِ ہند کو ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!'' کے نعرے کے تحت مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے کا ذریعہ بن گیا' جس کے نتیجے میں قیام پاکستان کا ''معجزہ'' صادر ہو گیا۔

تاہم یہ باتیں تو بہت بعد کی ہیں' اقبال کی ملی شاعری کا ڈنکا تو ۱۹۰۸ء ہی سے بجنا شروع ہو گیا تھا۔ اس سے جو احیائی جذبہ بیدار ہوا تھا اس نے مختلف پیکر اختیار کرنے شروع کر دیے تھے۔ ان میں اولاً جو داعی اور قائد سامنے آئے ان میں اہم ترین شخصیت ابو الکلام آزاد کی تھی اور جب ۱۹۲۰ء کے بعد وہ منظر سے ہٹ گئے تو جو دوسری شخصیت سامنے آئی اور جس کے نام کا شہرہ مشرق و مغرب میں ہوا وہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تھی۔

* * *

مولانا مودودی کی ولادت ۱۹۰۳ء میں ہوئی تھی۔ گویا علامہ اقبال سے تو وہ چھبیس برس چھوٹے تھے اور اس طرح ان دونوں کے مابین تو پوری ایک نسل کا واضح فصل تھا۔

البتہ جہاں تک مولانا آزاد کا تعلق ہے تو اگرچہ ''عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابِ''(بنی اسرائیل: ۱۲) کے اعتبار سے تو وہ ان سے صرف پندرہ برس چھوٹے تھے ،لیکن چونکہ مولانا آزاد بہت نو عمری میں نمایاں ہو گئے تھے (چنانچہ صرف چوبیس برس کی عمر میں مطلع ہند پر ''الہلال'' کی صورت میں نمودار ہو چکے تھے !) لہٰذا ان دونوں کے مابین بھی معنوی فصل کم و بیش بیس سال کا تھا ---- بہر حال جب ۱۹ - ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ نوجوان ابو الاعلیٰ نے شعور کی آنکھ کھولی تو اس وقت ہندوستان کی فضا میں ایک جانب حکیم الامت علامہ اقبال کی نہ صرف ملی شاعری اور اس سے پیدا شدہ احیائی جذبے کی دھوم تھی بلکہ ان کا ''فلسفہ خودی'' بھی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آ چکا تھا جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریۂ ''وحدت الشہود'' کے ظل کی حیثیت رکھتا ہے اور جس نے ہمہ اوستی خیالات اور وجودی تصوف کی جڑ کاٹ کر ''فنا فی اللہ'' کی بجائے ''بقا باللہ'' کو سلوک کے مقصود اور مطلوب کی حیثیت دے دی تھی' اور ''اسرارِ خودی'' کے بعد ''رموزِ بیخودی'' کے ذریعے نبی اکرم ﷺ کی اطاعت' محبت اور اتباع کو اصل الاصول قرار دے کر اسلام کے جداگانہ ملی تشخص کو از سر نو مستحکم کر دیا تھا۔ دوسری طرف الہلال اور البلاغ کے مدیر' حزب اللہ کے امیر' ''دار الارشاد'' کے بانی' اور قرآن اور جہاد فی سبیل اللہ کے داعی ابو الکلام آزاد کی شخصیت کا سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ چنانچہ جواں سال ابو الاعلیٰ نے ان دونوں اعاظم رجال سے بھرپور استفادہ بھی کیا اور گہرا تاثر بھی قبول کیا۔ اور اس طرح ''مجمع البحرین'' کی حیثیت اختیار کر کے ان دونوں کے مشن کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔

علامہ اقبال کے اتباع میں مولانا مودودی نے مغربی تہذیب کے اصول و مبادی اور اس کے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے !

کے مصداق نگاہوں کو چکا چوند کرنے والے مظاہر کو پوری خود اعتمادی کے ساتھ چیلنج کیا۔

اپنے سلیس' عام فہم اور دل نشین اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش کے ذریعے ''اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی'' (واضح رہے کہ یہ مولانا کی ایک اہم اور ابتدائی تالیف کا نام ہے) کی مفصل وضاحت اور مدلل اثبات کا فریضہ باحسن وجوہ سر انجام دیا۔ چنانچہ اسلام کے معاشرتی نظام پر ''پردہ'' اور اسلام کی اقتصادی تعلیمات کے موضوع پر ''سود'' ایسی مبسوط کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ رہیں اسلام کی سیاسی تعلیمات تو اگرچہ ان کے ضمن میں ان کا مختصر کتابچہ

''اسلام کا نظریۂ سیاسی'' ضخامت کے اعتبار سے ''بقامت ِکہتر'' کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اپنے پختہ اور محکم استدلال کی بنا پر یقینا ''بقیمت ِبہتر'' کا مصداقِ کامل ہے۔ ہر صاحب نظر جانتا ہے کہ ان جملہ امور میں مولانا مودودی کی اصل حیثیت علامہ اقبال کے شارح اور مفسر کی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ حضرت علامہ ہی کے اتباع میں مولانا مودودی نے بھی مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کا پُر زور اور مدلل اثبات کیا اور اور اس طرح وہ بھی مسلمانانِ ہند کی قومی جدو جہد کی تقویت کا ذریعہ بنے۔ چونکہ ادھر جمعیت علماء ہند ایسی طاقتور اور اثر و رسوخ کی حامل جماعت اور اس پر مولانا آزاد کی بھاری بھرکم شخصیت بھی پٹڑی بدلنے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہونے کے باعث ''متحدہ قومیت'' کی زور دار حمایت اور تائید کر رہے تھے' اور ادھر حضرت علامہ علالت کے باعث کسی قدر پس منظر میں جا چکے تھے 'لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں متحدہ قومیت کی مخالفت اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے اثبات کے میدان میں سب سے مؤثر اور فیصلہ کن کردار مولانا مودودیؒ کے قلم ہی نے ادا کیا۔ ان کی تالیفات ''مسئلہ قومیت'' اور ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے حصص اول و دوم کو اُس وقت کی قومی تحریک کے اہم ترین ہتھیاروں کی حیثیت حاصل ہو گئی ----- چنانچہ مولانا مودودی کے اسی قلمی جہاد کی بنا پر علامہ اقبال کی عقابی نگاہ ان پر پڑی اور انہوں نے انہیں دکن کی سنگلاخ زمین سے ''اچک'' کر اپنے خوابوں کی سرزمین یعنی مستقبل کے پاکستان کے زرخیز ترین خطے پنجاب میں لا بسایا۔

دوسری طرف الہلال اور البلاغ کی زوردار دعوتِ جہاد کی تائید و توثیق ہی نہیں مزید تفصیل اور توضیح کے لیے مولانا مودودی نے ''الجہاد فی الاسلام'' ایسی مبسوط اور معرکۃ الآراء کتاب تحریر کی جس نے ایمان کے اہم ترین رکن جہاد فی سبیل اللہ کے بارے میں مغرب کے زیر اثر پیدا ہونے والے معذرت خواہانہ انداز کی نفی کر دی 'جس کا نقطۂ عروج تو غلام احمد قادیانی کا نعرۂ منسوخیٔ جہاد و قتال تھا' تاہم اس کے جراثیم اس حد تک متعدی ہو چکے تھے کہ علامہ شبلی نعمانی ایسے لوگ بھی اس سے بالکل محفوظ اور مامون نہیں رہ سکے تھے۔

مزید برآں مولانا آزاد کے اتباع ہی میں مولانا مودودی نے بھی اس حدیث ِنبویؐ کے مطابق جس کی جانب مولانا آزاد ہی نے ۱۹۱۲ء میں توجہ دلائی تھی [''مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے' یعنی التزامِ جماعت کا حکم' امیر کے احکام کو سننے کا حکم' اطاعت کا حکم' ہجرت کا حکم' اور جہاد کا حکم!'' (مشکوٰۃ المصابیح بحوالۂ مسند احمدؒ و جامع ترمذیؒ عن الحارث الاشعری رضی اللہ عنہ)] مسلمانوں کو خالص غلبۂ دین اور حکومت ِالٰہیہ کے قیام کی جدو جہد کے لیے ایک منظم جماعت قائم کرنے کی دعوت دی۔ اس سلسلے میں جو زور دار مضامین انہوں نے لکھے اور جنہوں نے بعد میں ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے حصہ ٔسوم کی صورت اختیار

لی‘ ان کا نقطۂ عروج ’’ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت‘‘ نامی مضمون تھا جس کی اساس پر اگست ۱۹۴۱ء میں ’’جماعت اسلامی‘‘ قائم ہو گئی‘ جو گویا مولانا آزاد کی ’’حزب اللہ‘‘ کا معنوی تسلسل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے متعدد حضرات اس میں شامل ہو گئے جنہوں نے پہلے مولانا آزاد سے بیعت کر کے حزب اللہ میں شمولیت اختیار کی تھی‘ جیسے مستری محمد صدیق‘ ملک نصر اللہ خان عزیز‘ اور شیخ قمر الدین وغیرہ۔

* * *

مولانا مودودی کے اس ’’احیائی فکر‘‘ میں جماعت اسلامی کے قیام کے بعد خالص قرآنی اور دینی اصطلاحات کی پیوند کاری مولانا امین احسن اصلاحی کے ذریعے ہوئی‘

جس کے زیر اثر ایک جانب نصب العین کے ضمن میں ’’حکومت الٰہیہ‘‘ کی غیر قرآنی اصطلاح کی بجائے ’’اقامت دین‘‘ اور ’’خلافت علیٰ منہاج النبوۃ‘‘ کی خالص دینی اصطلاحات کا رواج ہوا۔ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری کے ضمن میں ’’امر بالمعروف و نہی عن المنکر‘‘ کی اس قرآنی اصطلاح پر جس کو مولانا آزاد نے اپنی دعوت کی اساس بنایا تھا ’’شہادت علی الناس‘‘ کی گہری فلسفیانہ قرآنی اصطلاح کا اضافہ ہوا۔

اسی طرح امت کی اصلاح اور قیامِ نظامِ خلافت کے طریق کار کے ضمن میں مولانا آزاد نے جس قولِ امام مالکؒ یا اثرِ صدیق اکبرؓ کا حوالہ دیا تھا گویا اس کی وضاحت کے سلسلے میں مولانا مودودی کا سب سے زیادہ معرکۃ الآراء خطبہ وہ ہے جو انہوں نے ۱۹۴۱ء ہی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سٹریچی ہال میں ’’اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے؟‘‘ کے موضوع پر دیا‘ جس کا ترجمہ مولانا مسعود عالم ندویؒ نے عربی زبان میں ’’منہاج الانقلاب الاسلامی‘‘ کے عنوان سے کیا۔ اس میں مولانا نے اسلامی ریاست یا حکومت کے قیام کی سعی یا بالفاظِ دیگر اسلامی انقلاب کی جدو جہد کی جملہ شرائط اور لوازم کا بیان نہایت وضاحت اور جامعیت کے ساتھ کیا اور ثابت کیا کہ ایک خالص قومی طرز کی جدو جہد کے نتیجے میں مسلمانوں کی ایک قومی ریاست تو وجود میں آ سکتی ہے‘ اسلامی ریاست یا حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہیں سے جماعت اسلامی کا راستہ مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گیا۔ اگر بات صرف اسی حد تک رہتی تو کوئی حرج نہ ہوتا‘ لیکن بعد میں‘ جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے‘ اس اختلاف میں شدت بھی پیدا ہوتی چلی گئی اور تلخی کا زہر بھی گھلتا چلا گیا۔

بایں ہمہ راقم کے نزدیک مولانا مودودی کا یہ پورا علمی و قلمی جہاد اور دعوت و تنظیم کی جملہ مساعی فکرِ اقبال

ہی کی تعمیل کے مرحلۂ ثانی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ البتہ جیسے کہ ہم ان ہی کالموں میں کچھ عرصہ قبل تفصیل سے عرض کر چکے ہیں‘ نبی اکرم ﷺ پر نبوت و رسالت کے اختتام کے بعد اب اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا عمل لا محالہ کچھ نا مکمل یا ناقص داعیوں ہی کی مساعی کے ذریعے سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۹ کے مطابق ’’درجہ بدرجہ‘‘ آگے بڑھے گا۔ ہر عبوری داعی اور قائد میں عزم و ہمت اور استقلال و استقامت کی کمی پر مستزاد فکر و فہم کی کوتاہی بھی

عین قرین قیاس ہے جس کا نتیجہ لا محالہ وقتی ناکامی ہی کی صورت میں نکلے گا‘ اگرچہ اس طرح تجدید و احیاء کا عمل بحیثیت مجموعی درجہ بدرجہ اور رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہے گا۔ چنانچہ یہی معاملہ ہے جو مولانا آزاد کی طرح مولانا مودودی کے ساتھ بھی پیش آیا۔

* * *

اس سلسلے میں داعیٔ اول یعنی مولانا آزاد کا معاملہ تو سادہ بھی تھا اور بسیط بھی۔ اس لیے کہ ان کی اصل حیثیت ایک پُر جوش‘ بلند آواز اور خوش الحان ’’مؤذن‘‘ کی تھی جس کی پکار پر نمازی جمع ہوئے ہی تھے کہ منتشر کر دیے گئے۔ پھر ان کی کوئی خاص تصانیف بھی نہیں تھیں‘ صرف کچھ خطبات تھے اور کچھ صحافتی مقالات (واضح رہے کہ ’’ترجمان القرآن‘‘ بہت بعد کی چیز ہے)۔ مزید برآں انہوں نے پسپائی بھی اختیار کی تو علی الاعلان (جس کے ضمن میں انہوں نے تو ’’وقت کی عدم مساعدت اور استعداد‘‘ کو موردِ الزام ٹھہرایا‘ لیکن ان کے بعض ساتھیوں اور بیعت کرنے والوں‘ مثلاً مولانا محمد علی قصوری‘ نے ان پر ’’بزدلی‘‘ تک کا الزام لگایا)۔ چنانچہ حزب اللہ اور دار الارشاد دونوں کی بساط انہوں نے اس طرح لپیٹی کہ پھر ان کا نام بھی کبھی نہیں لیا اور اپنے آپ کو ہمہ تن حصول آزادی کی جدو جہد (یا زیادہ سے زیادہ قرآن حکیم کے ساتھ ذاتی علمی شغل) کے لیے وقف کر دیا----- لیکن داعیٔ ثانی یعنی مولانا مودودی کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ ان کی قائم کردہ جماعت اپنے اصل ابتدائی نام لیکن علیحدہ علیحدہ نظاموں کے ساتھ سابق ہندوستان کے جملہ خطوں یعنی پاکستان‘ بھارت‘ بنگلہ دیش اور کشمیر میں موجود اور برسر کار ہے۔ پورے عالم اسلام میں اسی کو بر عظیم پاک و ہند کی اصل اور واحد اسلامی تحریک کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے اور غیر مسلم ممالک میں بھی اسے ایک قابل لحاظ بنیاد پرست قوت سمجھا جاتا ہے۔ بایں ہمہ اگر نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ تا حال کہیں کامیابی کی منزل کے آس پاس بھی نظر نہیں آتی تو اس کے اسباب میں جہاں خارجی اور ثانوی عوامل بھی شامل ہیں‘ وہاں داخلی طور پر خود داعی کے فکر کی چند بنیادی تقصیرات بھی ہیں جن کی وضاحت اس جدو جہد کے آئندہ تسلسل کے لازمی تقاضے کی حیثیت سے

ضروری اور لابدی ہے اور اللہ گواہ ہے کہ اس سے نہ ان کی توہین مقصود ہے نہ تنقیص۔

* * *

اس فکر کی اہم ترین اور سب سے بنیادی کمی ایمانی حقائق کے ادراک و شعور اور اس ''باطنی تجربے'' کی ضرورت و اہمیت سے خطرناک حد تک بے اعتنائی ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں تو نہایت جوش و خروش اور کیف و سرور کے ساتھ بیان کیا ہی ہے، ''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کے پہلے تین خطبات کا موضوع بھی بنایا ہے۔ اس بے اعتنائی نے اس تحریک میں روحانیت کا عنصر ابتدا ہی سے خطرناک حد تک کم کر دیا تھا' اور بالآخر اسے ایک خالص سیاسی تحریک بنا کر رکھ دیا۔ اس موضوع پر ایک مفصل بحث راقم الحروف نے اب (۱۹۹۲ئ) سے چھبیس برس قبل اپنی ایک تحریر ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' میں کی تھی۔

دوسری اہم تقصیر مولانا مودودی کے عمرانی فکر کی ہے کہ جہاں نقدی کے سود کی حرمت کو تو انہوں نے خود بھی خوب سمجھا اور بیان بھی خوب کیا' وہاں زمین کے سود' یعنی غیر حاضر زمینداری اور جاگیرداری کی نفی سے وہ یکسر قاصر ہی نہیں رہے' ان کی تائید اور تقویت کے لیے ایک کتاب بھی لکھ دی۔ پاکستان کی قومی سیاست کے اکھاڑے میں اترنے کے بعد تو یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ معاملہ حکمت ِعملی اور مصلحت اندیشی کی بنا پر ہوا ہو' لیکن حیران کن امر یہ ہے کہ فکر ِاقبال کا یہ گوشہ مولانا کی نگاہ سے ابتداءً کیسے اوجھل رہ گیا۔ شاید اس میں اصل عمل دخل حیدر آباد دکن کے ریاستی اور جاگیردارانہ ماحول کا ہو جس میں مولانا نے نشوو نما پائی تھی' واللہ اعلم۔ بہر حال اس تسامح یا تقصیر نے پاکستان میں اقامت دین کی تحریک کو انقلابی جذبے سے یکسر محروم کر دیا۔

تیسرا معاملہ جس کے ضمن میں مولانا مودودی سے تقصیر ہوئی' جماعت اسلامی کے لیے تنظیمی ڈھانچے کا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ دورِ نبوت سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک امت ِمسلمہ میں ''تنظیم'' کی واحد اساس ''بیعت'' رہی۔ چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ نے متعدد مواقع پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بیعتیں لیں' جن میں سے بیعت عقبۂ

ثانیہ تو آپ ﷺ کے پیغمبرانہ مشن کی تکمیل کے ضمن میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ پھر خلافت کا نظام قائم ہوا تو وہ بھی بیعت کی اساس پر تھا۔ خلافت ِراشدہ کے خاتمے کے بعد اصلاحِ حکومت کے لیے جتنی کوششیں ہوئیں (جس کی اُس وقت واحد ممکن العمل صورت ''خروج'' ہی کی تھی) تو وہ سب بھی بیعت کی اساس پر ہوئیں۔ پھر جب ع ''ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی'' والا معاملہ ہو گیا تو ایک جانب ملوکیت کا نظام بھی بیعت کی اساس پر قائم ہوا اور دوسری جانب سلوک و ارشاد کے سلسلے بھی بیعت ہی کی بنیاد پر قائم ہوئے۔ یہاں تک کہ گزشتہ صدی کے دوران جہاد کی جتنی تحریکیں پورے عالم اسلام میں برپا ہوئیں' خواہ وہ ہندوستان کی تحریک مجاہدینؒ تھی' خواہ لیبیا کی

سنوسیؒ تحریک‘ اور خواہ مہدی سوڈانیؒ کی تحریک‘ سب بیعت ہی کی اساس پر منظم ہوئیں۔ یہ سلسلہ موجودہ صدی کے آغاز تک قائم رہا۔ چنانچہ مولانا مودودی کے حوالے سے تو اہم ترین معاملہ مولانا آزاد کی ''حزب اللہ'' کا ہے جس کی تاسیس بیعت ہی کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ (بعد کی ایک اور مثال یہ ہے کہ جب علماء اسلام نے قادیانیت کے سدِباب کے لیے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا تو اس کے لیے بھی سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت مقرر کر کے ان سے بیعت کی گئی اور بیعت کرنے والوں میں مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ ایسے بیہقیٔ وقت بھی شامل تھے‘ جن سے علامہ اقبال نے متعدد بار درخواست کی تھی کہ لاہور منتقل ہو جائیں تاکہ دونوں مل کر فقہ اسلامی کی تدوین نو کا مشکل مرحلہ طے کر سکیں‘ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ بھی تھے‘جو طویل عرصے تک انجمن حمایت اسلام کے قائم کردہ ''اشاعت اسلام کالج'' کی مینجنگ کمیٹی کے صدر رہے تھے‘جس کے نگران علامہ اقبال اور سید غلام بھیک نیرنگ تھے۔)

چنانچہ خود مولانا مودودی کا اپنا ذہن بھی ان کے مارچ ۱۹۴۱ء کے ایک خط میں کھل کر سامنے آجاتا ہے جو انہوں نے جماعت اسلامی کے قیام سے صرف پانچ ماہ قبل حیدرآباد (دکن) کے مولانا محمد یونس مرحوم کے نام لکھا تھا‘ جسے انہوں نے اپنی تالیف ''خطوط کے چراغ'' میں شامل کیا ہے۔ اس میں مولانا نے بیعت کی تین قسمیں بیان کیں‘ یعنی: ایک وہ جو کسی خاص مرحلے پر کسی معین کام کے لیے لی جائے‘ جیسے بیعت

رضوان‘ دوسری بیعت سلوک و ارشاد‘ اور تیسری وہ بیعت ''جو اسلامی جماعت کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے'' جس کے ضمن میں وہ مزید وضاحت فرماتے ہیں کہ: ''اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مطیع رہے‘ اس وقت تک جماعت کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ .... الخ (یعنی ''جو مسلمان مرا اس حال میں کہ اس کی گردن میں بیعت کا حلقہ نہ تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا'' صحیح مسلمؒ عن عبد اللہ بن عمرؓ) اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان سب سے مراد یہی تیسری بیعت ہے‘ کیونکہ اس پر اسلامی جماعت کی زندگی اور اس کے نظام کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی ﷺ جس کام کے لیے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار آپؐ امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔''

اس کے باوجود اگر مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کے لیے بیعت کی اس منصوص‘ مسنون اور ماثور اساس کو چھوڑ کر مغرب سے درآمد شدہ تنظیمی ڈھانچہ اختیار کیا تو اس کی جو واحد وجہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب ''ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت'' کے جواب میں کچھ نوجوان اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ ساتھ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا امین احسن اصلاحی ایسی بھاری بھرکم مذہبی شخصیتیں بھی ''من نیز حاضرمی شوم'' کے مصداق حاضر ہو گئیں تو مولانا ان سے ''بیعت'' کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور ایک نیم جمہوری اور

نیم ''امیری'' ڈھانچہ اختیار کر لیا۔ چونکہ جماعت اسلامی کی امارت کے بارے میں مولانا کا اپنا ذہن وہی تھا جو اوپر درج ہوا' لہٰذا ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۶ء تک مسلسل پندرہ برس عملی اعتبار سے جماعت میں امارت یا ''آمریت'' اور جمہوریت یا ''شورائیت'' کے مابین کشاکش جاری رہی جو بالآخر ۵۷-۱۹۵۶ء میں دھماکہ خیز بحران کا سبب بن گئی' جس سے جماعت کی تحریک کو شدید نقصان پہنچا۔ اس کے برعکس اگر مولانا ۱۹۴۱ء ہی میں اپنے اس ذہن کو بروئے کار لانے کی جرأت کر لیتے جو بالآخر انہوں نے ۱۹۵۸ء میں شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو

میری تالیف ''تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب'') تو اگرچہ شروع میں ساتھ آنے والوں کی تعداد کسی قدر کم رہتی لیکن بعد میں دوام اور تسلسل برقرار رہتا۔ یوں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۷ء کے بحران پیدا نہ ہوتے۔ واللہ اعلم!

مولانا مودودی کے تحریکی فکر میں چوتھا ''خلا'' منہجِ انقلاب کے ضمن میں تھا' یعنی یہ کہ دعوت' تنظیم' تربیت اور ''کشاکشِ خس و دریا'' کے ابتدائی مراحل کے بعد جب مناسب قوت فراہم ہو جائے تو آخری ''اقدام'' یا انگریزی لفظ ''پوش'' یا ''پوچ'' (poach) کی عملی صورت کیا ہو گی؟ اس پر مولانا نے یا تو بالکل غور ہی نہیں کیا تھا' یا اس کے بیان کو خلافِ مصلحت سمجھا۔ اس لیے کہ ''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے؟'' نامی تحریر میں جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے' اسلامی انقلاب کے ان جملہ ابتدائی لوازم اور مراحل کو اپنے مخصوص طرز اور اسلوب میں بہ کمالِ حسن و خوبی بیان کرنے کے بعد (جن کا بیان راقم نے بھی اپنی بساط کے مطابق ان کالموں میں کچھ ہی عرصہ قبل ''نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے مراحل'' کے عنوان سے متعدد اقساط میں کیا ہے) مولانا مودودی نے بار بار اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے پر اکتفا کی ہے کہ ''تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خالص نظام حکومت ابھر آتا ہے جس کے لیے ان طاقتور اسباب نے جدو جہد کی ہوتی ہے'' اور ''آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی حکومت قائم ہو جائے گی جس کے لیے اس طرز پر زمین تیار کی گئی ہو'' اور اس طرح گویا آخری اقدام اور اس سے پیدا ہونے والے ''تصادم'' کے ذکر سے گریز کیا ہے۔ گویا علامہ اقبال نے منہجِ انقلابِ اسلامی کو اپنے جس معجز نما شعر میں بہ تمام و کمال سمو دیا تھا اس کے مصرعۂ اول یعنی ع ''بانشۂ درویشی در ساز و دما دم زن!'' کے جملہ تقاضے تو مولانا مودودی نے خوب سمجھے بھی اور سمجھائے بھی' لیکن مصرعۂ ثانی یعنی ع ''چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!'' کے تقاضے یا تو خود ان پر بھی پوری طرح واضح نہیں تھے' یا انگریز کی حکومت کے زمانے میں معاملہ ''مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آید راز!'' والا تھا۔ راقم کے نزدیک معاملہ پہلا تھا۔ اس لیے کہ اگر یہ ''خلا'' صرف مصلحت کی بنا پر ہوتا تو اس سے وہ مضر ہی نہیں

مہلک نتیجہ ہرگز برآمد نہ ہو سکتا جو حصولِ آزادی اور قیامِ پاکستان کے بعد ظاہر ہوا۔ یعنی میرے نزدیک یہ انقلابی اور تحریکی فکر کی اسی تقصیر کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے قیام پاکستان کے فوراً بعد جماعت اسلامی کو پاکستان کی انتخابی سیاست کے میدانِ کار زار میں داخل کر کے کشا کشِ اقتدار میں ایک فریق کی حیثیت دے دی ‘جس کے نتیجے میں اس کی ’’اصولی اسلامی انقلابی جماعت‘‘ کی حیثیت یکسر تبدیل ہو کر ’’اسلام پسند قومی سیاسی جماعت‘‘ کی صورت اختیار کر لُئی‘ جس کے جملہ منطقی تقاضے بعد میں ’’ناگزیر برائی‘‘ کے طور پر اور ’’أھوَن البلِیّتَین‘‘ کے قدیم شرعی حیلے کے مطابق پورے کیے جاتے رہے۔ رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید ع ’’کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!‘‘ جب اس قلب ماہیت کا ناگزیر نتیجہ اس صورت میں برآمد ہوا کہ جماعت کے قدیم کارکنوں کا رہا سہا انقلابی جذبہ بھی بالکل ختم ہو گیا تو انقلاب کے لیے ’’راست اقدام‘‘ کے تقاضوں کو فوری طور پر اور کسی قدر وسیع پیمانے پر پورا کرنے کے لیے ایک متبادل تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی‘ جو ’’پاسبان‘‘ کی صورت میں منصۂ شہود پر آچکی ہے!

راقم نے جماعت اسلامی کی اس ’’قلب ماہیت‘‘ پر اصولی لیکن مفصل کلام اپنے اس بیان میں کیا تھا جو ۱۹۵۶ء میں بحیثیت رکن جماعت اسلامی مرکزی مجلس شوریٰ کی مقرر کردہ ’’جائزہ کمیٹی‘‘ کی خدمت میں پیش کیا تھا (اور بعد میں ’’تحریکِ جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ‘‘ کے نام سے طبع ہوا)۔ اپنے اس بیان کے آخری باب ’’نتیجہ کلام‘‘ میں راقم نے یہ لکھا تھا کہ ’’میں نے نہ یہ کہا ہے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں جب طریق کار تبدیل کیا گیا تو دانستہ طور پر اس تبدیلی کا ادراک کرنے کے باوجود کیا گیا جو اس طرح اس پوری تحریک کی بنیادی نوعیت میں برپا ہو رہی تھی‘ لیکن یہ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ طریق کار کی اس تبدیلی نے جماعت کو سطحی طور پر متاثر نہیں کیا بلکہ اس کو جڑوں سے لے کر شاخوں تک اور سر سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا ہے اور اب اس جماعت کی بنیادی نوعیت تک میں فرق واقع ہو چکا ہے۔‘‘

اور پھر ’’تبدیلی کیوں؟‘‘ کے ذیل میں ’’اس کی وجہ‘‘ یہ معین کی تھی کہ ’’میں اگر ایک

لفظ میں اس اصل وجہ کو بیان کرنا چاہوں تو وہ ایک لفظ ’عجلت پسندی‘ ہے...‘‘ مزید برآں سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۷ اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱ کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ یہ کمزوری ’’انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور انسان کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے اس میں جزو لاینفک کے طور پر شامل ہے‘‘۔ لیکن اس وقت جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کا ایک اہم سبب فکر کا متذکرہ بالا ’’خلا‘‘ بھی تھا۔ چونکہ انقلابی جدوجہد کے آخری ’’اقدام‘‘ کے ضمن میں ذہن میں واضح نقشہ پہلے سے موجود نہیں تھا لہٰذا آزادی کے فوراً بعد پاکستان کی قومی سیاست کے میدان میں طاقت کا جو ظاہری خلا نظر آیا اس نے کشاں کشاں اپنے ’’دامِ ہمرنگِ زمیں‘‘ کی جانب کھینچ لیا! عجلت پسندی کے باعث یہ عظیم حقیقت ذہن سے اوجھل رہ گئی کہ انتخابات کسی نظام کو چلانے کے لیے منعقد

کیے جاتے ہیں‘ بدلنے کے لیے نہیں‘ جبکہ نظام کی تبدیلی صرف ’’تصادم‘‘ ہی کے ذریعے ممکن ہے!

* * *

الغرض‘ مولانا مودودی علامہ اقبال اور مولانا آزاد دونوں کے فکر و عمل کے جامع ہونے کے اعتبار سے تو بلا شبہ ’’مجمع البحرین‘‘ تھے‘ لیکن بد قسمتی سے تین معاملات میں تو وہ حضرت علامہ کے فکر سے پیچھے رہ گئے‘ یعنی ایک ایمانی کیفیات اور باطنی تجربہ کی اہمیت کے شعور و ادراک کے معاملے میں‘ دوسرے غیر حاضر زمینداری اور جاگیرداری کی حرمت کے بارے میں‘ اور تیسرے انقلابی عمل کے آخری مرحلے یعنی اقدام اور تصادم کے بارے میں ----- ایک معاملے میں وہ مولانا آزاد سے بھی پیچھے رہ گئے‘یعنی اسلامی انقلابی جماعت کے تنظیمی ڈھانچے کو بیعت کی منصوص‘ مسنون اور ماثور اساس پر استوار کرنے کی ہمت نہ کر پائے۔

بہر حال اسلام کے انقلابی فکر کی اس کامل تجدید کے بعد‘ جو اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال کے ذریعے نصف صدی سے زیادہ عرصہ قبل کرادی تھی‘ جس کے زیر اثر ’’ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!‘‘ کے مصداق ایران میں انقلاب برپا ہو گیا اور پسر اقبال ڈاکٹر جاوید

اقبال کی روایت کے مطابق وسط ِایشیا کی مسلمان ریاستیں بھی ’’ماڈل‘‘ کی تلاش میں ہیں‘ اگر خود اقبال کے خوابوں کی سر زمین پاکستان میں ’’گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!‘‘ کے مصداق تا حال اسلامی انقلاب کی منزل تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکی تو اس کا اصل سبب ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!

اور ؎

خلافِ پیمبرؐ کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید!

کے بموجب ’’منہجِ انقلابِ نبویؐ‘‘ کے صحیح فہم وشعور میں کمی یا موجود الوقت تصورات اور رجحانات کے دباؤ کے باعث اس کو پوری طرح اختیار کرنے سے قاصر رہ جانا ہے۔

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس عرصے کے دوران جو مساعی ہوئیں وہ بالکل رائیگاں

لئیں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ احیائے اسلام اور تجدید دین کا قافلہ رفتہ رفتہ اور درجہ بدرجہ آگے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ اب یہ حقیقت بحمد اللہ پوری طرح آشکار اور واشگاف ہو چکی ہے کہ اسلام صرف مذہب نہیں کامل دین ہے جو عدل اجتماعی کا بہترین' جامع ترین اور متوازن ترین نظام پیش کرتا ہے۔ پھر لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اس نظام کے برپا کرنے کا ولولہ بھی پیدا ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس پوری صدی کے دوران ع ''چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ !'' والی صورت عملاً برقرار رہی اور امت کے معتدبہ افراد نے ہر داعی کی آواز پر لبیک کہی اور تجدید و احیائے دین کی ''اولمپک ٹارچ'' کو کچھ نہ کچھ آگے ضرور بڑھایا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ فکر کی صحت کو برقرار رکھتے ہوئے عملی کوتاہیوں اور تقصیروں کی تلافی کی فکر کی جائے۔ اور ع ''چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی !'' اور ع ''اک فصل پکی تو بھر پایا تب تک تو یہی کچھ کرنا ہے !'' اور ''دما دم زن'' کے انداز میں جدو جہد جاری رکھی جائے !

باب سوم

اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل کے ضمن میں

اب تک کی مساعی کا حاصل

ان صفحات میں ''اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید اور علامہ اقبال'' اور ''فکرِ اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ جمعہ ۱۳ ، نومبر کو ملتان میں ''فاران اکیڈمی'' کے زیر اہتمام ''یومِ اقبال'' کی جو تقریب منعقد ہوئی اس میں نہ صرف یہ کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے مجھے مدعو کیا گیا بلکہ

میرے خطاب کا عنوان بھی ''عصر حاضر کے فکری تقاضے اور علامہ اقبال'' رکھا گیا۔ وہاں جو مختصر خطبہ ٔاستقبالیہ پروفیسر حفیظ الرحمن صاحب نے پڑھا اس کا آغاز ایران کے ملک الشعراء بہار کے اس شعر سے ہوا کہ ؎

عصرِ حاضر خاصۂ اقبال گشت
واحدے کز صد ہزاراں بر گزشت !

اس سے جہاں اس خیال کی مزید توثیق ہوئی کہ ایران کے حالیہ انقلاب کی بنیاد میں اقبال کا فکر کار فرما ہے' وہاں حضرت بہزاد لکھنوی کے اس مصرعے کے مطابق کہ ع ''حسرت آتی ہے یہ پہنچا' میں رہا جاتا ہوں !'' اس حسرت میں بھی اضافہ ہوا کہ ع ''گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا !'' کے مصداق ہم اقبال کے خوابوں کی سرزمین میں بسنے والے مسلمان تا حال کبھی خالص سیکولر اور کبھی نیم مذہبی مارشل لاء یا مغرب کے سیکولر جمہوری نظام کی بھونڈی نقالی کے چکر ہی سے نہیں نکل پائے۔ تاہم غنیمت ہے کہ وہ ''مردِ تن آساں'' ہم ایسے ''تن آسانوں'' کو یہ دلاسہ بھی دے گیا ہے کہ ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی !

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی !

سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص روحانی اور نفسیاتی پس منظر میں نبی اکرم ﷺ کو اپنے وہ احسانات یاد دلائے ہیں جو آپؐ پر حیاتِ دنیوی کے ابتدائی دور میں ہوئے تھے' یعنی:

{اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝ ۶ ۝ وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَہَدٰی ۝ ۷ ۝ وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۝ ۸ ۝ (الضحیٰ)

''کیا نہیں پایا آپؐ کو یتیمی کی حالت میں تو پناہ دی' اور پایا آپؐ کو تلاشِ حق میںسرگرداں تو ہدایت (کاملہ) سے سرفراز فرما دیا' اور پایا آپؐ کو تنگدست تو غنی کر دیا !''

اسی ہدایتِ خداوندی پر عمل کرتے ہوئے اگر ہم اللہ کے ان عظیم احسانات کا جائزہ لیں جو مستقبل کے اسلامی انقلاب کے ضمن میں ملتِ اسلامیہ پاکستان پر ہوئے ہیں تو مایوسی کے بادل چھٹنے لگتے ہیں' اور حسنِ اتفاق سے میرے نزدیک یہ بھی تعداد میں تین ہی ہیں' یعنی:(۱) اولین اور اہم ترین یہ کہ اسلام کے اجتماعی فکر اور حرکی

تصورات کی تجدید اور احیاء کا کام بحمد اللہ بتمام و کمال علامہ اقبال اور بعض دوسرے مفکرین اور مصنفین کے ہاتھوں سر انجام پا چکا ہے۔ چنانچہ ایمانی حقائق کا اثبات بھی عہدِ حاضر کی فکری سطح اور اعلیٰ ریاضی و طبیعیات' اور اعلیٰ نفسیات کی اساس پر علامہ کے ''خطبات'' کے ذریعے ہو چکا ہے' اور اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے مختلف پہلوئوں کی وضاحت بھی اقبال کے اشعار اور دوسرے حضرات کی تصانیف کے ذریعے ہو چکی ہے۔ (۲) اقبال نے ہندوستان کے شمال مغربی علاقے پر مشتمل جس ''آزاد مسلمان ریاست'' کی خوشخبری اپنے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں دی تھی وہ بھی ہماری تمام نا اہلیوں اور نالائقیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کے نتیجے میں ابھی ثابت و سالم موجود ہے۔ (اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں سورۂ ''ق'' کے الفاظ: {وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۝ ۳۵ ۞}اور سورۂ بنی اسرائیل کے الفاظ: {نَافِلَةً

لَّكَ ۞}(آیت ۷۹) کے مطابق دو خطوں پر مشتمل پاکستان عطا فرمایا تھا' یہ سراسر ہماری نااہلی تھی کہ ہم اسے دو لخت کرا بیٹھے' اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بچا کھچا پاکستان بھی محض اللہ کے فضل و کرم ہی سے قائم ہے' ورنہ ؎

''ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا!''

کے مصداق ہم نے تو اسے بھی برباد کرنے میں اپنی جانب سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ (اس ضمن میں ۶۹-۱۹۶۸ء کے لگ بھگ راقم نے اپنا یہ تاثر پروفیسر مرزا محمد منور کے سامنے بیان کیا کہ: ''مجھے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جب ہم ٹیڑھے ہونے لگتے ہیں تو اللہ پوری کائنات کو ٹیڑھا کر کے ہمارے ساتھ سازگار اور ہم آہنگ کر دیتا ہے'' تو اس سے مرزا صاحب بھی بہت محظوظ اور متاثر ہوئے تھے۔) (۳) آخری' لیکن اہمیت میں ہرگز کم نہیں' یہ کہ اگرچہ ہماری اب تک کی احیائی مساعی کا کوئی ٹھوس اور محسوس عملی نتیجہ تو تاحال برآمد نہیں ہو سکا تاہم ان کا یہ ثمرہ ہمیں بالفعل حاصل ہے کہ ایک کثیر تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں' اور ان میں ایک معتدبہ تعداد تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہے' جن کے دلوں میں احیائے اسلام اور غلبۂ دین کا جذبہ شدت کے ساتھ موجزن ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اقامت دِین کی منظم اجتماعی جدوجہد اور اس کے لیے تن من دھن کی قربانی ان کا دینی فریضہ ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ''ابتدائی سرمائے'' کی قدر کرتے ہوئے' اور سابقہ غلطیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے اس جدوجہد کو ع ''چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!'' اور ع ''اِک فصل پکی تو بھر پایا' تب تک تو یہی کچھ کرنا ہے!'' کے انداز میں جاری رکھا جائے اور حتی الامکان آگے بڑھایا جائے۔

اس سلسلے میں فی الوقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ دین کے ان اجتماعی اور تحریکی' یا بالفاظِ دیگر

''انقلابی'' تصورات کو برقرار رکھا جائے جو بہت طویل عرصے کے بعد از سر نو اجاگر ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ ایک جانب تو وقت کا ماحول اس کے ساتھ مطابقت اور موافقت نہیں رکھتا اور ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں اور ہو جائے تو مرجاتی ہے یا رہتی ہے خام!

کے مصداق نہ زمین اسے غذا دیتی ہے نہ فضا' جبکہ دوسری جانب نہ صرف یہ کہ مختلف احیائی تحریکوں کی وقتی اور فوری ناکامیوں کے طبعی نتیجے کے طور پر ان افکار اور تصورات کی کریڈیبلٹی کو خطرہ لاحق ہے' بلکہ بعض شکست خوردہ ذہنیت کے حامل لوگ جو کسی داخلی یا خارجی سبب کے باعث ان تحریکوں کے ساتھ نہیں چل پائے اور یا خود علیحدہ ہو گئے یا نکال دیے گئے' ایک مریضانہ نفسیاتی ردّ عمل کے تحت اس فکر ہی کو مجروح کرنے پر تُل گئے ہیں۔

اوپر دین کے اجتماعی اور عمرانی فکر' اور فرائض ِدینی کے تحریکی یا انقلابی تصور کے فروغ کی راہ کے موانع کے ضمن میں زمین اور فضا دونوں کی عدم موافقت کا جو ذکر آیا ہے وہ محض روا روی یا قلم کی روانی میں نہیں ہے' بلکہ ایک سوچی سمجھی تشبیہہ ہے۔ اس لیے کہ ایک جانب مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے ذہنوں میں دین کا جو محدود اور جامد مذہبی تصور صدیوں کے تعامل کے باعث راسخ ہو چکا ہے فی الواقع اس بنجر اور سنگلاخ زمین کے مانند ہے جو کسی حرکی اور انقلابی تصور کو غذا دینے سے انکاری اور اس کے فروغ کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے' جبکہ دوسری جانب مادہ پرستانہ افکار و نظریات' سیکولر نظامِ ریاست و سیاست' مخلوط اور اباحیت پسندانہ معاشرت وثقافت جو اس وقت پورے کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے' یقینا اس آسمان کے مانند ہے جو اسلام کے حقیقی اور جامع تصور کے ''شجرۂ طیبہ'' کو پنپنے کی اجازت دینے سے انکاری ہے (یہ دوسری بات ہے کہ اسلام کے عالمی غلبے کی ''تقدیر مبرم'' ----- ''وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ''اور ''وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ '' کے علی الرغم پوری ہو گی)۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جیسے ہر چہار جانب افق پر زمین اور آسمان باہم بغلگیر نظر آتے ہیں' بالکل اسی طرح دین کا محدود مذہبی تصور اور عالمی سیکولر تہذیب بھی ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ اور ہم آغوش ہیں۔ اس لیے کہ سیکولر نظام کا تو اصل الاصول ہی یہ ہے کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے وہ کامل ''رواداری'' کا مظاہرہ کرتا ہے کہ جملہ مذاہب کو تسلیم کرتے ہوئے ان سب کو اپنے پہلو میں جگہ دینے کے لیے تیار ہے۔ اسے کوئی خطرہ اور اندیشہ اگر ہے تو اسلام کے صرف اس اجتماعی تصور سے ہے جو پوری زندگی پر اپنا غلبہ چاہتا ہے۔

اس کی جنگ اگر ہے تو صرف ان ''بنیاد پرست'' (Fundamentalist) قوتوں سے جو اسلام کو دین ودُنیا اور عبادت وسیاست دونوں دائروں میں حکمران کرنا چاہتی ہیں۔ رہا دین کا وہ محدود مذہبی تصور جو عبادات و رسومات' مسجدو مدرسہ اور خانقاہ تک محدود رہے اور Politico-Socio-Economic System سے بحث نہ کرے تو اس کی

تو وہ پوری طرح سرپرستی کرنے پر ہمہ وقت آمادہ اور تیار ہے۔

مزید برآں‘ نیوٹن کے اس مشہور قانونِ حرکت کے مطابق کہ: ’’ہر عمل کا ایک مخالف اور مساوی ردِّ عمل لازمی ہے‘‘ بیسویں صدی عیسوی میں جیسے ہی علامہ اقبال‘ مولانا آزاد‘ علامہ مشرقی اور مولانا مودودی کے زیر اثر دین کا حرکی اور انقلابی تصور اجاگر ہونا شروع ہوا‘ قدیم جامد مذہبیت نے بھی ردّ عمل کے طور پر ’’تحریک‘‘ کی صورت اختیار کر لی‘ جس کا یہ عملی نتیجہ نگاہوں کے سامنے موجود ہے کہ بر عظیم پاک و ہند ہی سے اٹھنے والی ایک تحریک کے زیر اثر اس وقت پوری دنیا میں لاکھوں افراد دین کے قدیم محدود مذہبی تصور کے فروغ کے لیے ہر دم ’’حرکت‘‘ میں ہیں۔ اور یہ متذکرہ بالا ’’زمین و آسمان‘‘ دونوں کی اس تصور کے ساتھ سازگاری اور موافقت ہی کا تو مظہر ہے کہ اس تحریک کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی حاصل ہو رہی ہے۔ (یہ بالکل دوسری بات ہے کہ راقم کو یقین حاصل ہے کہ جیسے ہی کوئی حقیقی انقلابی قوت نظامِ باطل اور مظاہر فسق و فجور کو بالفعل چیلنج کرتے ہوئے میدانِ عمل میں آئی‘ تقویٰ اور تدین کے اس محدود تصور کے حامل لوگ بھی ؎

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک !

کے مصداق جامد و ساکت نہیں رہ سکیں گے۔ اور ؎

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے‘ تو سوئے دار چلے !

کے مصداق کشاں کشاں ’’مقتل‘‘ کی طرف کھنچے چلے آئیں گے !)

تیرہ سو سال کے زوال اور انحطاط کے نتیجے میں دین کے اس جامد اور محدود مذہبی

تصور کی جڑیں مسلمانوں کے قلوب و اَذہان میں جتنی گہری اتر چکی تھیں اس کی اس صدی کے آغاز میں ایک مثال تو اس صورت میں سامنے آئی کہ اس کے باوجود کہ مولانا آزاد کو ایک بہت بڑی مذہبی شخصیت یعنی اسیر مالٹا حضرت شیخ الہندؒ کی تائید حاصل تھی لیکن روایتی علماء کی عمومی مخالفت کا ایک ہی ریلا انہیں بہا کر لے گیا‘ اور ان کے ’’امامت ِہند‘‘ اور حکومت ِالٰہیہ‘‘ کے سارے خواب چکنا چور ہو کر رہ گئے۔ دوسری مثال ایک بہت بڑے عالم شریعت اور شیخ طریقت کی اس تلقین کی صورت میں سامنے آئی کہ ہمیں کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہیے جس سے

ہمارے غیر ملکی حکمرانوں (انگریزوں) کو تشویش لاحق ہو' اس لیے کہ انہوں نے ہمیں مذہبی آزادی دی ہوئی ہے' جس پر ایک نہایت بھرپور پھبتی چست کی تھی علامہ اقبال نے کہ ؎

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اوریہاں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہا جا رہا کہ یہ علامہ اقبال ہی کی قد آور شخصیت تھی جس نے اس جامد اور محدود مذہبی تصور کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے۔ اگر اس زمین میں حضرت علامہ کی شاعری کا ہل نہ چل چکا ہوتا تو کسی بھی داعیٔ دین کے لیے روایتی علماء کے اس جمود کے علی الرغم دین کے حرکی اور انقلابی تصور کو لے کر اٹھنا ہرگز ممکن نہ ہوتا!

بہر حال اس داستان کا المناک ترین باب یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں بعض ایسے حضرات جو کچھ عرصہ دین کے اس حرکی تصور کی اساس پر اٹھنے والی تحریکوں سے وابستہ اور ان تصورات کے پُر جوش حامی رہے' جب کسی عملی یا شخصی اختلاف کی بنا پر' یا کسی ذاتی سبب کے باعث علیحدہ ہو گئے یا خارج کر دیے گئے تو اب رجعت قہقری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کبھی تو ع ''کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!'' کے مصداق یہ فرماتے ہیں کہ اقامت ِدین کی جدو جہد کی فرضیت کا تصور ہی باطل ہے' کبھی کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب تو صرف دعوت و تبلیغ اور تذکیر و تلقین سے آتا ہے' اس کے لیے تصادم اور جہاد کا تصور فتورِ عقل کا مظہر ہے' کبھی کہتے ہیںکہ بیعت صرف حکومت کی ہو سکتی ہے' جماعت کے قیام کے لیے کوئی دوسری صورت تو اختیار کی جا سکتی ہے.بیعت ِسمع و

طاعت فی المعروف کی نہیں' اور کبھی اس سے بھی آگے بڑھ کر فرماتے ہیں کہ دین کی خدمت کا کام تو صرف انفرادی یا زیادہ سے زیادہ اداروں کی صورت میں ہونا چاہیے' اس کے لیے کسی جماعت کے قیام کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے! وَ قِسْ عَلٰی ذٰلِکَ۔

اوریہ بھی اس محدود مذہبی تصور کی سیکولرازم کے ساتھ مطابقت اور موافقت ہی کا مظہر ہے کہ دین کے یہ جدید دانشور کبھی صلح حدیبیہ کو حق و باطل کے مابین ''مستقل'' مفاہمت اور مصالحت کے لیے دلیل بناتے ہیں' اور کبھی میثاقِ مدینہ کو عصر حاضر کے سیکولر نظامِ ریاست و سیاست کے حق میں دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح کبھی رجم کی ''وحشیانہ'' سزا کی نفی کے ذریعے جدید ذہنیت کی خدمت میں ہدیۂ معذرت پیش کرتے ہیں تو کبھی پردے کے ''مولویانہ تصور'' کی مخالفت کے ذریعے مغربی تہذیب کے دلدادگان کو تقویت پہنچاتے ہیں --- تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر ایسے لوگوں کی بھارت میں تو سرکار دربار ہی نہیں راشٹریہ سیوک سنگھ کے حلقوں میں

بھی پذیرائی ہو' اور پاکستان میں بھی دین و شریعت کی عملی پابندیوں اور اقامت ِدین کی جدو جہد کی ''تپتی راہوں'' سے گریز اور دین کی صرف زبان و قلم کے ذریعے خدمت کی ''ٹھنڈی چھائوں'' میں پناہ گزینی کے خواہش مند حضرات ان پر دل و جان سے فدا ہوں ! تاہم اقبال کے خوابوں کا مظہر پاکستان' ان شاء اللہ العزیز' اسلام کے ان حقیقی تہذیبی و ثقافتی' سماجی و معاشرتی' اقتصادی و معاشی اور سیاسی و ملی تصورات کی نشأۃِ ثانیہ کا گہوارہ بنے گا ''جن کے روئے انور پر عہد ِملوکیت کے دوران پردے پڑ گئے تھے'' (خطبہ الٰہ آباد)' اور جن کی فکر و نظر کی سطح پر کامل تجدید اللہ تعالیٰ نے اس صدی کے آغاز میں علامہ اقبال کے ہاتھوں کرا دی تھی ! ----- ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ایک جانب دین کے ان حرکی اور انقلابی تصورات کا پوری قوت کے ساتھ دفاع کیا جائے اور دوسری جانب اپنی جدو جہد کو ع ''بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست'' کے مصداق ''منہج انقلابِ نبویؐ'' کے زیادہ سے زیادہ مطابق اور موافق بنایا جائے۔ اس لیے کہ وہی کامیابی کی واحد سبیل ہے !

* * *

باب چہارم

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ میں تدریج اور اس کے تقاضے

سب جانتے ہیں کہ یہ ''معجزہ'' تو پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی بار رونما ہوا تھا کہ ایک ہی فرد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعوت کا آغاز بھی فرمایا' ابلاغ و تبلیغ اور نشر و اشاعت کے جملہ تقاضے بھی پورے کیے' پھر جن لوگوں نے دعوت کو قبول کیا انہیں نہ صرف جمع کیا بلکہ ایک نہایت مضبوط و محکم تنظیمی سلسلے میں منسلک کیا' پھر ان کا تزکیہ نفس بھی کیا اور تعلیم و تربیت کے تمام تقاضے بھی پورے کیے' پھر اولاً عدم تشدد اور صبر محض' پھر اقدام اور

چیلنج‘ اور بالآخر مسلح تصادم کے مراحل سے بھی گزارا‘ اور ہر مرحلے پر بنفس نفیس خود ہی قیادت اور رہنمائی فرمائی‘ حتیٰ کہ سپہ سالاری کے جملہ فرائض بھی ادا کیے‘ ... اور کل بیس برس کے عرصے میں یہ سارے مراحل طے کر کے لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے ملک میں انقلاب کی تکمیل فرما دی اور اللہ کے دین کو غالب کر دیا ! (فصلی اللہ علیہ و آلہ و سلم)

اب ایک جانب تو اس حقیقت کو سامنے رکھیے‘ اور دوسری جانب اس امر کو کہ قرآن حکیم کے صغریٰ کبریٰ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے‘ اور احادیث ِنبویہؐ میں تو صراحت کے ساتھ اس کی خبر دی گئی ہے کہ قیامت سے قبل ایک بار پھر اللہ کا دین اللہ کی زمین پر اسی شان کے ساتھ غالب ہو گا جس شان سے اب سے چودہ سو سال قبل ہوا تھا ... اور اس بار یہ غلبۂ دین پورے کرۂ ارضی کو محیط ہو گا اور پورا عالم انسانی توحید کے نور سے بالفعل منور ہو جائے گا... بقول اقبال ؎

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی !
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہو کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی !
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے ! !

چنانچہ مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے اپنے مبارک زمانے سے قیامِ قیامت تک پانچ ادوار کا ذکر فرمایا ... یعنی (i)دورِ نبوتؐ (ii)دورِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ (iii)ظالم ملوکیت کا دور (iv)مجبوری والی بادشاہت (یعنی غلامی) کا دور ... اور (v)دوبارہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ! ان میں سے چوتھے دور سے مراد غالباً مغربی امپریلزم کا دور ہے جو براہ راست حکومت کے اعتبار سے تو ختم ہو چکا ہے مگر تا حال بالواسطہ اقتدار یعنی سیاسی و معاشی تسلط اور تہذیبی و ثقافتی غلبے کی صورت میں جاری ہے ... اس طرح اس وقت گویا نوعِ انسانی آنحضور ﷺ کے بیان کردہ ادوار کے اعتبار سے چوتھے اور پانچویں کے درمیان عبوری دور اور برزخی مرحلے میں ہے !

ادھر قرآن حکیم میں تین بار تو یہ فرمایا گیا کہ:

{ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ}(التوبۃ: ۳۳‘ الفتح: ۲۸‘ الصف: ۹)

’’وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کرے اسے ُکل دین یا تمام ادیان پر۔‘‘

گویا نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد ’’غلبۂ دین ِحق‘‘ ہے... اور دوسری طرف مختلف

اسلوبوں سے تین ہی بار یہ فرمایا کہ آپ ﷺ کی بعثت تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ جیسے مثلاً سورۂ سبا کی آیت ۲۸ میں فرمایا:

{وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا}

’’ہم نے نہیں بھیجا ہے آپؐ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!‘‘

اب ان دونوں کو یعنی منطق کی اصطلاح میں ’’صغریٰ اور کبریٰ‘‘ کو جمع کر لیں تو صریح نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اب جب بھی دوبارہ ’’خلافت علیٰ منہاج النبوۃ‘‘ کا دور دنیا میں آئے گا تو یہ خلافت عالمی اور آفاقی اور پورے عالم انسانی اور کرۂ ارضی کو محیط ہو گی۔

مزید برآں اس کی صریح پیشین گوئیاں بھی صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ چنانچہ:

(i) مسند احمد بن حنبلؒ ہی میں حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((لَایَبقٰی علٰی ظَھرِ الارضِ بَیتُ مَدَرٍ وَ لَا وَبَرٍ اِلّا اَدخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَۃَ الاسلام‘ بِعِزِّ عزیزٍ وَ ذُلِّ ذلیلٍ‘ اِمَّا یُعِزُّھم اللّٰہ فیجعلھم مِن اَھلِھا اَو یُذِلُّھم فَیَدِینُونَ لھا)) قلتُ: ’’فَیَکُونَ الدِّینُ کُلّہ لِلّٰہ‘‘

’’روئے ارضی پر کوئی ایک گھر بھی ایسا نہیں بچے گا‘ خواہ وہ اینٹ گارے کا بنا ہوا ہو خواہ کمبلوں کے خیمے کی صورت میں ہو‘ جس میں اللہ کلمہ اسلام کو داخل نہ کر دے‘ خواہ کسی عزت والے کے اعزاز کے ساتھ‘ خواہ کسی پست ہمت کے ضعف کے ذریعے۔‘‘ (یعنی یا تو گھر والا خود ایمان لے آئے گا یا اسے اسلام کی بالا دستی قبول کرنی ہو گی!) اس پر حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا: ’’تب تو وہی بات پوری ہو جائے گی کہ... کل دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے!‘‘ (اشارہ ہے سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ کی جانب)

(ii) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلمؒ میں روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الۡاَرۡضَ فَرَأَیتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا‘ وَاِنَّ اُمَّتِیَ سَیَبلُغُ مُلکُھَا مَا زُوِیَ لِیَ مِنھَا))

’’اللہ تعالیٰ نے میرے لیے کل زمین کو لپیٹ دیا (یا سکیڑ دیا)۔ چنانچہ میں نے

اس کے سب مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی۔ اور سن رکھو! کہ میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر یا سکیڑ کر دکھا دیئے گئے!''

لہٰذا قرآن پر ایمان اور صحیح احادیث پر یقین رکھنے والے کسی انسان کو ہرگز شک نہیں ہو سکتا کہ قیامت سے قبل پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ بالکل اسی طرح ہو گا جس طرح آنحضور ﷺ کے دورِ مبارک میں ہوا تھا... لیکن اس امر میں بھی ہرگز کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ وہ ''معجزہ'' دوبارہ ہرگز رونما نہیں ہو سکتا کہ یہ مرحلہ کسی ایک ہی داعی کی دعوت اور انقلابی جدو جہد سے طے ہو جائے۔ اس لیے کہ اس معاملے میں ''امتناعِ نظیر'' یعنی آنحضور ﷺ کا بے مثل اور بے مثال ہونا آپؐ پر ختم نبوت اور تکمیلِ رسالت کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے... لہٰذا اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے' یعنی یہ کہ یہ مہم مرحلہ وار سر ہو اور پے در پے اور یکے بعد دیگرے ایسی ''تحریکیں'' اٹھیں جو اس کام کو درجہ بدرجہ بالکل اسی طرح آگے بڑھائیں جس طرح کا نقشہ سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۹ میں سامنے آتا ہے' یعنی: {لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾}(تم لازماً ترقی کرو گے درجہ بدرجہ یا ایک ایک سیڑھی کر کے!'') اور جس کی عام فہم تمثیل اولمپک ٹارچ سے دی جا سکتی ہے جسے ایک کھلاڑی لے کر دوڑتا ہے اور کچھ فاصلہ طے کر کے دوسرے کو تھما دیتا ہے' جو اسے کچھ دور اور لے جا کر تیسرے کے حوالے کر دیتا ہے... اور اس طرح شمع آگے بڑھتی رہتی ہے!... گویا وہ کام جو اس طرح چودہ سو سال قبل محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں اور جانثاروں (رضی اللہ عنہم اجمعین) نے صرف ایک انسانی زندگی کے مختصر عرصہ میں کر دکھایا تھا اب دوبارہ چار یا پانچ نسلوں میں بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو بہت بڑی کامیابی ہو گی!

اب اگر یہ بات درست ہے' اور یقیناً درست ہے' تو اس کے کچھ لازمی اور منطقی نتائج بھی ہیں' جن کو اچھی طرح سمجھ بھی لینا چاہیے اور ذہنی اعتبار سے قبول بھی کر لینا چاہیے' ورنہ شدید بددلی اور مایوسی کا سامنا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہیں کہ:

(۱) اوّلین اور اہم ترین بات یہ کہ اس آخری داعی سے قبل جس کے ہاتھوں یہ کام

پایۂ تکمیل کو پہنچے گا' جتنے بھی ابتدائی یا درمیانی داعی آئیں گے ان کے فکر و فہم اور تصورات میں بھی کسی نہ کسی اعتبار سے نقص یا محدودیت ہو سکتی ہے' اور ان کے عزم و عزیمت' صبر و مصابرت اور ہمت و استقامت میں بھی مختلف پہلوئوں سے ضعف یا کمی ہو سکتی ہے۔ تب ہی تو وہ آخری کامیابی سے قبل ہی کسی مقام تک پہنچ کر بے دم اور بے حال ہو کر رہ جائیں گے یا ''عجلت پسندی'' کے باعث کسی ''شارٹ کٹ'' کے ''دامِ ہمرنگِ زمین'' میں پھنس کر رہ جائیں گے... لیکن ظاہر ہے کہ اگر وہ ع ''میرا سب کچھ مرے خدا کا ہے!'' کے مصداق اور {لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا} ''اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں ٹھہرائے گا مگر اُس کی وسعت کے مطابق'' (سورۃ البقرۃ: ۲۸۶ اور چار مزید

مقامات) کے قانونِ الٰہی کے مطابق اپنا سب کچھ اس کام میں لگا اور کھپا دیں گے تو چاہے دنیوی اعتبار سے بالفعل آخری منزلِ مراد یعنی غلبۂ دین تک نہ پہنچ پائیں عند اللہ سرخرو ہوں گے اور اُخروی نجات و فلاح کے حقدار ہوں گے!

(۲) ان درمیانی یا عبوری ''داعیوں'' کے ساتھیوں اور اعوان و انصار میں سے بھی جہاں بہت سے لوگ ان داعیوں کی کم ہمتی کے باعث یا ع ''کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!'' کی شکایت کی بنا پر علیحدگی اختیار کریں گے وہاں بہت سے خود اپنی کم ہمتی اور کم کوشی یا ذاتی تکبر اور حسد کی بنا پر بھی علیحدہ ہوں گے... پھر ان میں سے بھی بعض تو صرف عملی پسپائی کی راہ اختیار کرنے ہی پر اکتفاء کریں گے جبکہ بعض زیادہ ذہین اور چالاک لوگ اپنی کم ہمتی کو چھپانے یا اپنے خبث ِباطن پر پردہ ڈالنے کے لیے فکری اعتبار سے بھی ''رجعت ِقہقری'' کا مظاہرہ کریں گے اور ''انگور کھٹے ہیں'' کی طرح اس انقلابی فکر ہی کو نا قابل اعتبار قرار دیں گے جس کی اساس پر جدو جہد شروع کی گئی تھی۔ اس کے برعکس حقیقت پسندی اور اولو العزمی کا تقاضا یہ ہو گا کہ ان جملہ حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور ''گندم اگر بہم نہ شود بھس غنیمت است!'' پر عمل کرتے ہوئے سفر کو جاری رکھا جائے اور اس پر تو غور و خوض مسلسل جاری رکھا جائے کہ ہم کسی غلطی کا ارتکاب تو نہیں کر رہے' یا ہم کہیں کوئی غلط موڑ تو نہیں مڑ آئے' لیکن صرف اپنی یا اپنے ساتھیوں کی

''کم کوشی'' کے باعث ''مایوس'' ہو کر کام سے دست کش نہ ہوا جائے (بقول اقبال ؎

مایوس نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی!)

... تاکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ان الفاظ کے مطابق جو انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہے تھے کہ: ''میں تو آنے والے کی راہ صاف کرنے والا ہوں!'' ہر درمیانی داعی اور اس کے ساتھی اپنے بعد آنے والے کے لیے راہ بھی صاف تر کر دیں اور اس کے لیے کچھ نہ کچھ ساز و سامان بھی فراہم کر کے جائیں تاکہ اسے دوبارہ سارا کام از سر نو ہی نہ شروع کرنا پڑے!

ان اصولی باتوں کو ذہن میں مستحضر رکھتے ہوئے اب حالیہ تاریخ پر نظر ڈالیے تو صاف نظر آجائے گا کہ بیسویں صدی عیسوی ''احیائے اسلام'' کی جدو جہد کی صدی ہے۔ چنانچہ اس کے آغاز کے ساتھ ہی وہ عمل بھی شروع ہو گیا تھا جسے اسلام اور اُمت ِمسلمہ کے ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جو اس صدی کے ربع اول کے خاتمے کے بعد تو پوری شدت اختیار کر گیا تھا۔ اس ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' کے دو محاذ نہ صرف یہ کہ

ایک دوسرے سے بالکل جدا تھے بلکہ ان کے تقاضے بعض اعتبارات سے ایک دوسرے سے متضاد بھی تھے ... یعنی (۱) قومی اور عوامی محاذ' جس پر مغربی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لیے آزادی کی تحریکیں برسر عمل تھیں اور (۲) خالص احیائی محاذ' جس پر ''تجدید و احیائے دین'' کا معرکہ گرم تھا۔

بر عظیم پاک و ہند میں اول الذکر محاذ مسلم لیگ نے سنبھالا جس کی تاسیس ۱۹۰۶ء میں ہوئی اور کل اکتالیس برس کی جدو جہد کے ذریعے اس نے پاکستان قائم کر کے بر عظیم پاک و ہند کے کم از کم دو تہائی مسلمانوں کو یک وقت انگریزوں اور ہندوئوں دونوں کی غلامی سے نجات دلوا دی۔ دوسرے محاذ پر پہلے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' والے ابو الکلام آزاد اٹھے جنہوں نے ۱۹۱۳ء میں ''حزب اللہ'' قائم کی اور ''حکومت ِالٰہیہ'' کے قیام کی زور دار اذان دی 'لیکن ابھی لوگ جمع ہو ہی رہے تھے کہ بظاہر ذاتی ''امامت'' منعقد نہ

ہونے کے باعث اور در حقیقت ان اسباب کی بناء پر جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے' پوری بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی۔ اس کے کچھ عرصے بعد مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم ''تجدید و احیائے دین'' کے داعیے اور ''الجہاد فی الاسلام'' کے ولولے کے ساتھ سامنے آئے (واضح رہے کہ یہ دونوں مولانا کی دو شہرۂ آفاق تالیفات کے نام ہیں !) اور اس زور دار دعوت کے ساتھ ''جماعت اسلامی'' بھی قائم کر دی اور اس میں اپنی ''امامت و امارت'' بھی نصب کر دی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ''احیائی محاذ'' پر گراں قدر کامیابیاں حاصل کیں اور نمایاں پیش قدمی کا مظاہرہ کیا... لیکن ان سطور کے راقم کے نزدیک جماعت اسلامی بھی قیام پاکستان کے وقت ''راہِ یسیر'' یعنی شارٹ کٹ کی بھول بھلیوں میں گم اور ملکی سیاست کی دلدل میں پھنس اور دھنس کر رہ گئی ... اور اب ایک بار پھر ایسے باہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو اس شمع کو تیسری نسل میں بھی نہ صرف یہ کہ روشن رکھیں بلکہ احیاء اسلام کی اس جدو جہد کو اور آگے بڑھانے کے لیے تن من دھن وقف کر دیں' اور یہ طرز عمل اختیار کریں کہ (بقول فیض) ؎

یہ فصل امیدوں کی ہمدم' اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی' اب کے بھی اکارت جائے گی
دھرتی کے کونوں کھدروں میں' پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو !
پھر مٹی سینچو اشکوں سے' پھر اگلی رُت کی فکر کرو !
پھر اگلی رُت کی فکر کرو' جب پھر اِک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا' تب تک تو یہی کچھ کرنا ہے ! !

تقریباً پون صدی پر پھیلی ہوئی اس تاریخ میں اہم ترین اور جامع ترین شخصیت علامہ اقبال کی ہے۔ ان کے بارے میں جس قدر غور کیا جائے حیرت بڑھتی چلی جاتی ہے کہ ع ''ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی!'' چنانچہ ان کی یہ ''جامعیت'' حیرت انگیز ہے کہ وہ واحد رہنما ہیں جو بیک وقت قومی اور احیائی دونوں محاذوں پر اس درجہ سرگرمِ عمل رہے کہ اگر ایک جانب وہ فکر اسلامی کے ''مجدد'' ہیں (''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید''

ان کے خطبات کا عنوان ہے) تو دوسری جانب تصورِ پاکستان کے ''خالق'' اور نظریہ پاکستان کے ''موجد'' بھی ہیں۔ اسی طرح وہ داعی الی القرآن بھی ہیں اور حکیم الاسلام بھی' اور اگرچہ ''دعوت الی القرآن'' کے میدان میں' اس کے باوجود کہ اس کا آغاز کرنے والے وہی تھے' بعد میں کچھ عرصہ زیادہ گھن گرج مولانا ابو الکلام کی سنائی دیتی رہی تھی... تاہم جہاں تک قرآن کے فلسفہ و حکمت کے بحر عمیق میں غواصی کا تعلق ہے تو اس میدان میں تو وہ بالکل تنہا ہیں اور ان کا کوئی دوسرا شریک یا مثیل ہے ہی نہیں!

مزید برآں جس طرح ڈیڑھ دو صدی قبل شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ علیہ کی نگاہِ دُور رس نے ''ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی'' کے لیے احمد شاہ ابدالی کا انتخاب کیا تھا اور اسے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی' صرف اسی طرح نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر حضرت علامہ کی عقابی نگاہ نے ایک جانب لندن میں جا بسنے والے محمد علی جناح کو ''قومی ناخدا'' کی حیثیت سے معین کیا' اور خود انہیں اس پہلو سے ''خود شناسی'' کا جوہر عطا کیا' جبکہ دوسری جانب حیدر آباد (دکن) میں مقیم ابو الاعلیٰ مودودی کو ''متکلم اسلام'' ہونے کا اہل سمجھا اور انہیں اس خطے میں منتقل ہونے کی دعوت دی جس کے بارے میں ان کی چشمِ باطن اور نگاہِ دور بین دیکھ چکی تھی کہ وہاں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام ''تقدیر الٰہی'' ہے۔ (۱۹۳۰ء کا خطبہ الٰہ آباد)

تاہم امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہی کی طرح علامہ اقبال بھی بنیادی طور پر صرف مفکر اور ''مصور'' تھے اور عملی جدو جہد کے میدان میں اتر کر جماعت بنانے اور تحریک برپا کرنے کو ان کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے عملی کام جو بھی تھوڑا بہت کیا وہ صرف قومی محاذ پر کیا (اور وہ بھی ثانوی حیثیت میں!) ... احیائی میدان میں عملی طور پر یا خیری برادران اور علامہ مشرقی اترے یا مولانا آزاد اور مولانا مودودی۔ ان میں سے بھی پہلے تین تو تاریخ کے اوراق اور ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکے ہیں' البتہ مولانا مودودی اس اعتبار سے زندہ ہیں کہ پاکستان اور بھارت ہی نہیں بنگلہ دیش اور کشمیر میں بھی ان کی قائم کردہ جماعت قائم اور موجود ہی نہیں فعال اور متحرک بھی ہے۔

باقی رہیں ان کی تصانیف اور تالیفات تو ان کا شہرہ تو پورے عالم اسلامی ہی نہیں پوری دنیا میں ہے !
اِس وقت ہمیں اس امر سے بحث نہیں ہے کہ پاکستان یا بھارت میں مولانا مودودی کی قائم کردہ جماعت سے

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں !

کے مصداق کہاں کہاں سے ہوتی ہوئی اب کس مقام پر ہے بلکہ صرف اس امر واقعی کا تذکرہ مقصود ہے کہ اس عرصے کے دوران جو لوگ اس قافلے سے علیحدہ ہوئے یا خارج کر دیے گئے ان میں سے اکثر تو جمود اور تعطل کا شکار ہو گئے یا صرف علمی یا تعلیمی سرگرمی تک محدود ہو کر رہ گئے۔ بقیہ میں سے بھی بعض تو وہ ہیں جو اس کے بنیادی انقلابی فکر کو حرزِجاں بنائے ہوئے اپنے فہم اور استعداد کے مطابق عملی جدو جہد میں مصروف و مشغول ہیں، جن میں سے ایک ان سطور کا راقم بھی ہے ... لیکن بعض وہ بھی ہیں جو اب اس بنیادی انقلابی فکر ہی کو غلط قرار دے رہے ہیں ... ان میں سے ایک نمایاں شخص بھارت میں ہیں یعنی مولانا وحید الدین خاں، جو بھارت کے سرکاری حلقوں اور بالخصوص بی جے پی اور آر ایس ایس کے منظورِ نظر ہیں، اور ایک پاکستان میں ہیں یعنی علامہ جاوید احمد غامدی جن کا خصوصی ہدف اس وقت یہ خاکسار اور اس کے نظریات ہیں۔

* * *

اسلام کے انقلابی فکر سے انحراف کی راہیں

باب پنجم 1

صرف وعظ و نصیحت اور تعلیم و تلقین
یا کچھ اور بھی؟

باب ششم 1

انقلاب نبویؐ کی تکمیل:
ہجرت کے موقع پر یا فتح مکہ کے بعد؟

باب پنجم

صرف وعظ و نصیحت اور تعلیم و تلقین یا کچھ اور بھی؟

''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کی وضاحت کے سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر ان خیالات پر بھی ڈال لی جائے جو ہماری معروضات پر تنقید اور تبصرے کے ضمن میں ایک فاضل مضمون نگار کی اس تحریر میں سامنے آئے ہیں جو ایک قومی روزنامے میں دو اقساط میں شائع ہوئی ہے' اس لیے کہ اس میں انہوں نے نہایت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ ایک خاص مکتب فکر کی کامل ترجمانی کر دی ہے جس سے قارئین کے لیے اس کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہو گیا ہے' جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔ فاضل مضمون نگار اس اعتبار سے بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے پوری دیانت داری کے ساتھ ایسے بہت سے خیالات و نظریات کی علیحدہ علیحدہ تصویب و تائید کر دی ہے جن کو اگر جمع اور مرتب کر لیا جائے تو ''منہجِ انقلاب'' کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے ! فَالْحَمْدُ اللهِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

اس بات میں تو ہرگز کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ انفرادی سطح پر ایک مسلمان کے دینی فرائض

یہی ہیں کہ وہ اپنے عقائد کی تصحیح اور ایمان میں اضافے کے لیے مسلسل کوشاں رہے‘ صوم و صلوٰۃ اور دیگر جملہ فرائض و واجبات پابندی سے ادا کرتا رہے‘ حلال پر اکتفا کرے اور حرام سے اجتناب کرے‘ حتی المقدور اور حسب صلاحیت دوسروں کو خیر کی دعوت دیتا رہے‘ نیکیوں کی تلقین کرتا رہے‘ بدی سے روکتا رہے وَقِسْ عَلٰی ذٰلک!

لیکن اب ذرا ایک نظر اجتماعی نظام اور اس کی اہمیت پر بھی ڈال لینی چاہیے اور

حسب ذیل سوالات پر غور کرنا چاہیے:

(۱) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ عہدِ حاضر کا انسان اجتماعی نظام میں جس طرح جکڑا ہوا ہے‘ پہلے کبھی نہ تھا۔ چنانچہ موجودہ دور میں جو بھی پولیٹیکو سوشیو اکنامک سسٹم (Politico- Socio- Economic System) کسی ملک اور معاشرہ میں قائم ہو اس کا

ہمہ گیر اور ہمہ جہت جبر ہر انسان کو اپنے چنگل میں پوری طرح جکڑ لیتا ہے؟

(۲) پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اگر یہ نظامِ اجتماعی‘ جبر و استبداد اور ظلم و استحصال پر مبنی ہو جس سے انسان ایک جانب ’’مُستکبِرین‘‘ اور ’’مُستضعَفین‘‘ میں اور دوسری جانب ’’مُترفین‘‘ اور ’’محرومین‘‘ میں تقسیم ہو کر رہ جائیں تو اس صورت میں انفرادی دعوت و تبلیغ اور وعظ و تلقین کا دائرہ بہت محدود‘ اور اثرات تقریباً معدوم ہو کر رہ جاتے ہیں؟ مثلاً کیا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا یہ تجزیہ درست نہیں ہے کہ جس معاشرے میں تقسیمِ دولت کا نظام غلط ہو جائے وہاں ایک جانب دولت کے انبار لگ جاتے ہیں جس سے عیاشیاں اور بدمعاشیاں جنم لیتی ہیں‘ اور دوسری جانب عوام کی عظیم اکثریت ڈھور ڈنگر اور بار برداری کے جانور بن کر رہ جاتی ہے اور ان کے لیے کسی اعلیٰ خیال تک رسائی ہی محال ہو جاتی ہے‘ کجا اللہ کی معرفت کا حصول اور اس سے لو لگانے کا معاملہ!

(۳) اگر ان دو سوالات کا جواب اثبات میں ہے‘ تو کیا اس استبدادی اور استحصالی نظام کا خاتمہ ضروری نہیں ہے؟ کیا اس کی جگہ عدل و قسط پر مبنی اور سماجی انصاف کی ضمانت دینے والا نظام قائم کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت نہیں ہے؟ اور کیا کتاب و سنت اس بارے میں بالکل خاموش ہیں؟ کیا سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں یہ نہیں فرمایا گیا:

{لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَہُمُ الْکِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ؕ}

’’ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں اور تعلیمات کے ساتھ بھیجا‘ اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (یعنی عدلِ اجتماعی کی ضمانت دینے والی شریعت) نازل

لی‘ تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا بھی اتارا‘ جس میں جنگ کی شدید صلاحیت ہے‘ اور لوگوں کے لیے دوسرے فائدے بھی ہیں‘ تاکہ اللہ دیکھے کہ کون ہیں وہ (وفا دار بندے) جو غیب کے باوجود اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔‘‘

اور کیا سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ کی ان آیاتِ مبارکہ میں امر کا صیغہ وارد نہیں ہوا کہ:

{یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ} (النسائ: ۱۳۵)

’’اے اہل ایمان ! عدل و قسط کو پوری قوت کے ساتھ قائم کرنے والے اور اللہ کے حق میں گواہی دینے والے بنو ! ‘‘

اور

{یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۰} (المائدۃ: ۸)

’’اے اہل ایمان ! اللہ کے لیے پوری طاقت کے ساتھ کھڑے ہو جائو‘ عدل و انصاف کے گواہ بن کر ! ‘‘

اور اگر ان میں امر کا صیغہ ہی استعمال ہوا ہے تو آیا ان سے وجوب ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟

(۴) پھر اگر ان سوالات کے جوابات بھی اثبات میں ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے اہم مقاصد کے لیے طریق کار اور لائحہ عمل کی رہنمائی سے کتاب و سنت خالی ہیں؟ کیا اسوۂ رسول ﷺ صرف داڑھی کے طول اور پائجاموں کی اونچائی ہی سے متعلق ہے یا اس اہم انسانی اور دینی فریضے کے ضمن میں بھی رہنمائی کرتا ہے؟ یقیناً کسی مسلمان کا خیال یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ سنت اور اسوۂ رسول ﷺ صرف ظاہری وضع قطع تک محدود ہیں‘ اور اگر خدانخواستہ ہو تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے !

(۵) پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بالفعل یہ کارنامہ سر انجام دیا کہ انسانوں کے مابین اونچ نیچ‘ جبر و استبداد اور ظلم و استحصال کی جڑ کاٹ کر رکھ دی اور ’’دین الحق‘‘ یعنی نظامِ عدل و قسط کو قائم کر کے دکھا دیا؟ اگر یہ حقیقتِ واقعی کسی مسلمان کو نظر نہ آئے تو

سوائے ماتم کے اور کیا کیا جا سکتا ہے کہ ع ’’جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے‘ باغ تو سارا جانے ہے ! ‘‘ اس لیے کہ اغیار اور اعداء سمیت پوری دنیا تو اس عظیم حقیقت کا برملا اعتراف کرتی ہے !

اب اگر یہ ساری باتیں صحیح ہیں، تو ہمارا ''دعویٰ'' صرف یہ ہے کہ سیرت النبی ﷺ ہی اس عظیم انقلاب کے طریق کار اور لائحہ عمل کا واحد منبع اور سرچشمہ ہے، لہٰذا ہم اس کی جانب رجوع اس مجبوری کے تحت کر رہے ہیں کہ ؎

جزدار اگر کوئی مفر ہو تو بتائو
ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں !

تاہم اگر کسی کے پاس کوئی متبادل لائحہ عمل ہو تو لائے اور پیش کرے ع ''آئے یہ گوئے ہے، اور یہ چوگان !''... ہمیں تو علیٰ وجہ البصیرت معلوم ہے کہ ''جا ایں جاست''... اور ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است !

کے مطابق سیرت النبیؐ کے راستے کے سوا سارے راستے کسی نہ کسی دوسری منزل کی جانب لے جانے والے ہیں، اللہ کے عطا کردہ نظامِ عدل و قسط کے قیام کی جانب نہیں !

ترسم کہ بہ کعبہ نہ رسی اے اعرابی
کیں راہ کہ تو می روی بہ ترکستان است !

ہاں اس کے ہم بھی یقیناً قائل ہیں کہ بدلے ہوئے حالات کے مطابق جہاں جہاں ضرورت ہو اجتہاد سے کام لیا جانا چاہیے۔ اس ضمن میں فاضل مضمون نگار نے تو صرف ایک فرق کی جانب توجہ دلائی ہے کہ آنحضور ﷺ نے کام کفار میں کیا تھا، اب ہمیں مسلمانوں میں کرنا ہے، جبکہ ہمارے سامنے تو دو امور اور بھی ہیں، یعنی ایک یہ کہ آنحضور ﷺ کے زمانے میں عرب میں کوئی منظم حکومت قائم نہیں تھی اور مسلح تصادم کے آغاز کے وقت بھی اسلام اور کفر کی طاقت میں نسبت تناسب (تعداد اور اسلحہ کے فرق دونوں کے مجموعی اعتبار سے) ایک اور دس سے زیادہ کا نہیں تھا جب کہ آج جو پولیٹیکو

سوشیو اکنامک سسٹم قائم ہیں ان کی پشت پر بے پناہ قوتوں سے مسلح مقامی حکومتیں ہی نہیں عظیم عالمی قوتیں بھی ہیں، جن کے ساتھ عوام کے مسلح تصادم کا معاملہ تقریباً محال کے درجہ میں آچکا ہے... دوسرے یہ کہ آج بحمد اللہ

شہریوں کے بنیادی حقوق کا تصور موجود ہے جو اُس وقت نہیں تھا۔ چنانچہ مسلح تصادم سے کم تر ذرائع سے بھی ''انقلاب'' برپا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان امور کے ضمن میں ہمارا موقف یہ ہے کہ ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کو اصل اور بنیاد قرار دے کر معین طور پر طے کرنا ہو گا کہ کس ضرورت کے تحت اس میں کس مقام پر کیا اجتہادی تبدیلی ضروری یا مناسب ہے! یہ طرز عمل قطعاً غلط ہو گا کہ ان تین امور کی اساس پر نبویؐ طریق کو سرے سے ترک کر کے پورا نقشہ کار اپنے ذہن و فکر اور اپنی ترجیحات کی بنیاد پر وضع کر دیا جائے۔

الحمد للہ کہ فاضل مضمون نگار نے بعض باتیں بہت صحیح اور بالکل درست فرمائی ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کو جمع کر لیا جائے اور ان کے درمیان حکیمانہ تالیف و تدوین کی صورت پیدا کر دی جائے۔ مثلاً:

(۱) ایک یہی بات کہ ''سیاسی اور تمدنی ارتقاء کے حوالے سے مغرب نے ایسے تجربے ضرور کیے ہیں جو اسلامی اصولوں کے خلاف نہیں!'' ہمارے نزدیک یہ بات اس اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ مغرب کے ان تجربات ہی کے ذریعے ''انسانی حقوق'' کا وہ تصور دنیا میں دوبارہ پیدا ہوا جو مسلمانوں میں ملوکیت کے رواج کے بعد دنیا سے ناپید ہو گیا تھا' جس کا حوالہ ہم اوپر دے آئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان تجربات کے لیے مغرب والوں نے کوئی جدو جہد کی تھی یا نہیں' اور اپنا خون بھی دیا تھا یا نہیں؟ یہ انسانی سعی و جُہد اور ایثار و قربانی کے ذریعے ہوئے تھے یا خود بخود آسمان سے ٹپک پڑے تھے؟ اور کیا یہ فرائض اب بھی صرف مغرب ہی کے لیے ہیں اور ہمارے لیے ''فقط اللہ ہو' اللہ ہو' اللہ ہو'' ہی ہے؟ بِیّنُوا تُؤجرُوا!

(۲) اسی طرح یہ بات بھی نظری طور پر تو صد فی صد درست ہے کہ ''اگر کسی ملک کے عوام کی اکثریت اسلامی تحریک کی پشت پر ہو تو بلٹ کی بجائے یہ انقلاب بیلٹ کے ذریعے بھی

آسکتا ہے اور جلسے جلوسوں' مظاہروں اور سول نا فرمانی کے ذریعے بھی آسکتا ہے جو آج کے سیاسی منظر میں قابل قبول ہے!'' لیکن واقعی اعتبار سے اس لیے مغالطہ آمیز ہے کہ عوام کی اکثریت کبھی نہیں بدلا کرتی بلکہ ہمیشہ ''خاموش اکثریت'' (silent majority) کی صورت اختیار کیے رہتی ہے اور انقلاب ہمیشہ ایک منظم اور تن' من' دھن قربان کرنے والی اقلیت کے ذریعے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتخابات کے ذریعے کوئی انقلاب یعنی پولیٹیکو سوشیو اکنامک سسٹم میں کوئی اساسی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی' اس لیے کہ انتخابات میں ''تعداد'' ہی فیصلہ کن ہوتی ہے... لہٰذا واحد ممکن راستہ دوسرا ہی رہ جاتا ہے' یعنی مظاہروں اور سول نا فرمانی کا 'جس کے کم از کم ''جواز'' بلکہ غالباً استحباب کا فتویٰ خود فاضل مضمون نگار نے صادر فرما دیا ہے۔ فجزا اللہ احسن الجزائ۔

(۳) اسی طرح یہ بات بھی صد فی صد درست ہے کہ ''جمہور فقہاء نے ایک غیر معیاری مسلم حکومت کے خلاف صرف اس صورت میں خروج (مسلح تصادم) اور مزاحمت کی اجازت دی ہے جب خروج کے لیے اٹھنے والوں کے

پاس اتنی سیاسی اور عسکری طاقت موجود ہو کہ ان کے غلبے کے امکانات غالب ہوں اور پھر ان میں اتنی صلاحیت نمایاں طور پر نظر آتی ہو کہ وہ غیر صالح نظام کو اکھاڑ کر اس کی جگہ ایک نیا صالح نظام قائم کر سکیں!'' لیکن سوال یہ ہے کہ سیاسی اور عسکری قوت کیا از خود آسمان سے نازل ہو جائے گی یا انسانی کوشش کے ذریعے فراہم کی جائے گی اور اسی طرح مطلوبہ صلاحیت بھی آنِ واحد میں پیدا ہو جائے گی یا اس کے لیے بھی پیہم جدو جہد لازمی ہو گی اور کوئی نظامِ تعلیم و تزکیہ مرتب کرنا پڑے گا؟ اگر جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ کوشش اور جدو جہد کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے تو یہی تو سیرتِ نبویؐ سے ماخوذ طریقِ انقلاب کے ابتدائی تین مراحل ہیں' یعنی (i)دعوت و تبلیغ کے ذریعے انسانوں کی افرادی قوت کی فراہمی (ii)تنظیم کے ذریعے انہیں ایک اجتماعی طاقت اور ''بنیانِ مرصوص'' بنانا (iii)تعلیم و تزکیہ کے ذریعے ان میں مطلوبہ صلاحیت پیدا کرنا! ... ہم تو مسلح تصادم کو بحالاتِ موجودہ تقریباً خارج از امکان سمجھتے ہیں' مظاہروں اور سول نافرمانی کے آغاز سے قبل بھی

ان تین مراحل کے مؤثر حد تک پورے ہو جانے کے شدت کے ساتھ قائل ہیں! تو پھر اختلاف ہے کہاں؟

گویا بات وہی ہے جو ہم عرض کر چکے ہیں کہ فاضل مضمون نگار علیحدہ علیحدہ طور پر ہماری ہر بات کی تصویب کر رہے ہیں' البتہ ان کو جمع کر کے ایک وحدت کی صورت دینے سے جو معاملہ سامنے آتا ہے اس سے کنی کترانا چاہتے ہیں۔ ہم ان کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری رائے کی نہایت صحیح اور جامع تعبیر فرمائی' یعنی ''ڈاکٹر صاحب کے فلسفۂ انقلاب کی تلخیص یہ ہے کہ یہ سادہ تبلیغ سے شروع ہو کر تنظیم و تربیت اور کشمکش و مزاحمت کے مراحل سے گزرتا ہوا تخت یا تختہ کی جنگ پر منتج ہوتا ہے' جس میں یا تو انقلابی گروہ کامیاب ہو کر اسلامی انقلاب برپا کر دیتا ہے یا ناکام ہو کر مظلومانہ شہید ہو جاتا ہے لیکن اللہ کی راہ میں سرخرو ہو جاتا ہے''... لیکن حیرانی اس بات پر ہے کہ انہوں نے اسے غلط قرار دے کر' پھر اس کے ایک ایک جزو کی تصویب بھی فرما دی ہے! اسی طرح یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ''تخت یا تختہ'' سے اس قدر الرجک کیوں ہیں جب کہ یہ تو عام محاورہ ہے کہ ''یا تختہ جگہ آزادی لی' یا تخت مقام آزادی کا!'' پھر خود انہوں نے ایران کے انقلاب کی بھی تصویب کی ہے' تو کیا وہاں تخت یا تختہ کا معاملہ نہیں تھا اور کیا جناب آیت اللہ خمینی کامیابی کی صورت میں ''تختِ حکومت'' پر متمکن نہیں ہو گئے تھے' اور اگر وہ ناکام ہو جاتے تو کیا پھانسی کے تختے کے سوا ان کا کوئی اور مقام ہوتا؟... پھر وہ تاریخ اسلام کے صدرِ اوّل کے واقعات و حوادث میں سے حسینؓ بن علیؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ (رضی اللہ عنہم اجمعین) کی مساعی کو بھی' بحمد اللہ' بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں تو کیا وہاں تخت یا تختہ والا معاملہ نہیں ہوا؟... اب ذرا ایک قدم مزید پیچھے چلے جائیں اور ۱۶ اور ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ کی درمیانی شب کی کیفیت پر غور کریں جب فخر موجودات و سید البشر محمد رسول اللہ ﷺ زندگی کے طویل ترین سجدے میں دعا کر رہے تھے کہ: اے اللہ! اگر کل یہ مٹھی بھر مسلمان' جو میری پندرہ

برس کی کمائی ہیں‘ سب قتل ہو گئے تو پھر قیامت تک تجھے پوجنے والا کوئی نہیں ہو گا !... تو کیا اُس وقت معاملہ تخت یا تختہ کا نہیں تھا؟بَیِّنُوا تُؤجَرُوا!

79

حاصل ِکلام یہ کہ ’’منہجِ انقلابِ نبویؐ‘‘ کا ایک ایک جزو اپنی جگہ اتنا حتمی و قطعی‘ واضح و بین اور ظاہر و باہر ہے کہ ہر مسلمان خواہی نخواہی اسے جانتا بھی ہے اور مانتا بھی‘ حتیٰ کہ جو لوگ اس کی نفی کے لیے قلم اٹھاتے ہیں وہ بھی مجبوراً اس کی تائید ہی کرتے ہیں‘ لیکن اصل معاملہ وہ ہوا ہے کہ ؎

اڑائے کچھ ورق لالے نے‘ کچھ نرگس نے‘ کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری !

کے مصداق اس کُل کے اجزاء منتشر ہو گئے ہیں‘ اور اب ضرورت صرف ان کی تالیف اور تدوین کی ہے تاکہ وہ ایک وحدتِ کبریٰ اور حیاتیاتی اکائی کی حیثیت سے ابھر اور نکھر کر نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو جائے‘ جس سے ان شاء اللہ بہت سے ایسے مخلص لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی جو اس وقت غلط فہمی میں اِدھر اُدھر کی پگڈنڈیوں میں بھٹک رہے ہیں... وما توفیقی الا باللہ !

* * *

80

باب ششم

انقلابِ نبویؐ کی تکمیل:
ہجرت کے موقع پر یا فتح ِمکہؑ کے بعد؟

اسلام کا وہ اصل انقلابی فکر کیا ہے جس نے اب سے چودہ سو سال قبل ریگزارِ عرب میں اس انقلاب کو جنم دیا تھا جسے پوری دنیا نے تاریخ انسانی کا عظیم ترین' جامع ترین اور صالح ترین انقلاب تسلیم کیا ہے' اور جس کے نتیجے میں ''خلافت ِراشدہ'' کی صورت میں وہ نظامِ عدلِ اجتماعی' خواہ تھوڑی مدت ہی کے لیے سہی' لیکن بالفعل قائم ہو گیا تھا جس میں انسانی حریت' اخوت اور مساوات کی جملہ اعلیٰ اقدار کو نہایت صحیح اور موزوں نسبت وتناسب اور توازن و اعتدال کے ساتھ سمو دیا گیا تھا' اور جس کی یاد اب نوعِ انسانی کے اجتماعی حافظے میں ایک حسین خواب کے مانند محفوظ ہے؟ پھر خلافت ِراشدہ کے اختتام پر' جب مسلمانوں کا نظام حکومت تدریجاً پہلے مجرد ''خلافت'' اور اس کے بعد با ضابطہ ''ملوکیت'' میں تبدیل ہو گیا تو اس سے دین و دنیا اور مذہب و سیاست میں جو علیحدگی ہوئی اس سے مسلمانوں کے دینی فکر اور مذہبی تصورات میں کیا تنزل رونما ہوا جو مغربی استعمار کے دو سو سالہ دور میں اپنی منطقی انتہا کو پہنچ گیا؟ پھر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلام کے انقلابی فکر کا تدریجی احیاء کن عظیم شخصیتوں کے ہاتھوں ہوا؟ بالخصوص بر عظیم پاک و ہند میں اس ضمن میں پہلے علامہ اقبال نے اپنی پُر شکوہ اور جذبہ پرور شاعری اور پھر مولانا مودودی نے اپنی سلیس' عام فہم اور دلنشین نثر کے ذریعے کیا کردار ادا کیا؟ پھر جماعت اسلامی میں کچھ عرصہ فعال اور سرگرم رہنے اور اس فکر کے پُر جوش مبلغ اور پرچارک رہنے کے بعد جب بھارت اور پاکستان میں کچھ لوگ جماعت سے از خود علیحدہ

ہو گئے یا اس سے ''خارج'' کر دیے گئے تو وہ اس فکر کو کس طرح مسخ اور مجروح کر کے اس کے رُخ کو دوبارہ دورِ انحطاط کی جانب موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں؟ یہ موضوع نہایت اہم ہونے کے ساتھ طوالت طلب بھی ہے ... تاہم سر دست صرف اس تحریر کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنی مقصود ہیں جو اولاً ایک قومی روزنامے میں چار اقساط میں اور پھر ایک دوسرے روزنامے میں یکمشت لیکن کسی قدر فرق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس ضمن میں پہلے تین باتیں تمہیدی نوعیت کی ہیں' اور پھر تین ہی باتیں اصل بحث کے متعلق۔

تمہیدی باتوں میں اولین یہ کہ میں ایک دوسرے صاحب ِقلم کی طرح جن کے فرمودات پر اس سے قبل تبصرہ کیا جا چکا ہے' اس مقالے کے فاضل مقالہ نگار کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے بھی اس منہج انقلاب کی تعبیر (دو غلطیوں کے سوا) بہت حد تک صحیح کی ہے جو میں نے سیرت النبی ﷺ سے اخذ کیا ہے۔ اس سے امید ہوتی ہے کہ ؎

دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئی' کئی دور چل گئے !

کے مصداق میری اپنی تحریر کے مکمل ہونے سے پہلے اگر اس کے خلاصے کی اس طرح ''گردان'' ہوتی رہی تو ان شاء اللہ کم از کم قارئین کو تو وہ ازبر ہو جائے گا۔ فجزاهما الله احسن الجزاء !

دوسری بات یہ کہ میں اس امر پر تعجب کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان حضرات کو اس معاملے میں اس قدر عجلت کیوں ہے کہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کی تردید پر کمربستہ ہو گئے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ذرا توقف کر لیا جائے اور میری بات کو مکمل ہو لینے دیا جائے۔ اس سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے۔ بصورت دیگر تنقید زیادہ جامع بھی ہو گی اور جاندار بھی۔ تاہم اس کے فیصلے کا اختیار ان ہی کے ہاتھ ہے !

تیسری بات متذکرہ بالا دو غلطیوں سے متعلق ہے... یعنی ایک یہ کہ میں نے انقلابی جدو جہد کے جن چھ مراحل کا استنباط سیرت النبی ﷺ سے کیا ہے ان میں کبھی

''ہجرت'' کو مستقل مرحلے کی حیثیت سے شمار نہیں کیا۔ اس سے قبل پہلے فاضل مضمون نگار نے بھی ہجرت کا تذکرہ کیا تھا لیکن چونکہ اس میں حوالہ مولانا امین احسن اصلاحی کی معرکۃ الآراء تصنیف ''دعوتِ دین اور اس کا طریق کار'' کا تھا اس لیے میں نے سکوت اختیار کیا تھا۔ اس لیے کہ میں اس کتاب کی علمی قدر و قیمت اور صحت ِاستدلال کا تہہ دل سے قائل ہوں' تاہم اب چونکہ بات بلا حوالہ آئی ہے تو عرض ہے کہ اگرچہ میرے نزدیک آنحضور ﷺ کی انقلابی جدو جہد کے چوتھے مرحلے یعنی صبر محض یا عدم انتقام کے دور سے نکل کر پانچویں مرحلے یعنی اقدام' چیلنج اور جوابی کارروائی کے دور میں داخلے کے ضمن میں ہجرت مدینہ کو فیصلہ کن دخل حاصل ہے' اور اب بھی اگر حالات تقاضا کریں اور بالفعل کوئی ''دار الہجرت'' موجود بھی ہو تو یہ راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے (جیسے کہ حال ہی میں جہادِ افغانستان کے سلسلہ میں ہوا !) تاہم تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں جس طرح مسلح تصادم لازم نہیں رہا بلکہ احتجاجی تحریک اور ترکِ موالات کے ذریعے بھی انقلاب کا آخری مرحلہ سر کیا جا سکتا ہے اسی طرح ''ہجرت'' کا مرحلہ بھی لازمی نہیں رہا۔ ہاں ایک ہجرت لازمی ہے' یعنی وہ جس کی وضاحت نبی اکرم ﷺ نے اس سوال کے جواب میں فرمائی تھی کہ ''یا رسول اللہ ! سب سے افضل ہجرت کون سی ہے؟'' تو آپؐ نے جواباً ارشاد فرمایا تھا: ''اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ'' یعنی ''تم ہر اس چیز یا عمل کو ترک کر دو جو تمہارے رب کو نا پسند ہے !'' (نسائیؒ عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما)۔ تاہم اس ہجرت کا تعلق انقلابی جدو جہد کے تیسرے مرحلے یعنی ''تربیت'' سے ہے۔

اسی طرح ''خاموش اکثریت'' کے بارے میں بھی میرے موقف کی تعبیر صحیح طور پر نہیں کی گئی۔ میرے نزدیک ''خاموش اکثریت'' خاموش تو ہوتی ہے' اندھی بہری نہیں ہوتی' اور جب وہ انقلاب کے داعیوں اور کارکنوں کی سیرت و کردار اور قربانی و ایثار' اور ان پر ہونے والے ظلم و تشدد کا مشاہدہ کرتی ہے تو اس کی ہمدردیاں

رفتہ رفتہ ان کے ساتھ ہوتی چلی جاتی ہیں اور آخری تصادم کے مرحلے میں یہ تبدیلی فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔
اصل بحث کی طرف آیئے تو اس کے ضمن میں اہم ترین معاملہ ایک ''مغالطہ'' کا

83

ہے (جس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مقالہ نگار کو کسی غلط فہمی کے باعث لاحق ہو گیا ہے یا وہ ضدم ضدا کے باعث اسے جان بوجھ کر دوسروں کو لاحق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں) اور وہ یہ کہ ہجرت کے فوراً بعد بلکہ اس سے بھی قبل مدینہ منورہ میں انقلاب کی تکمیل ہو چکی تھی اور وہاں صرف ''دعوت'' کے نتیجے میں ایک اسلامی حکومت یا ریاست قائم ہو چکی تھی۔ گویا اس کے بعد کے مراحل انقلاب کی توسیع کے ہیں' نفسِ انقلاب کے نہیں! جبکہ میرا موقف یہ ہے کہ ہجرت کے بعد اگرچہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو ''دارالامن'' میسر آگیا تھا جسے ''دار السلام'' بھی قرار دیا جا سکتا ہے' اور مجازیا استعارہ کے طور پر اسلامی حکومت یا ریاست سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے (جیسے کہ بعض دوسرے مصنفین کی طرح بعض مواقع پر خود میں نے کیا ہے)' لیکن یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے کہ حکومت اور ریاست کی اصطلاح سے جو چیز آج کی دنیا میں معروف ہے وہ جزیرہ نمائے عرب میں فتح مکہ کے بعد قائم ہوئی تھی۔ اس سے قبل مسلمانوں کی اصل حیثیت ایک انقلابی جماعت کی تھی اور نبی اکرم ﷺ کی بنیادی حیثیت تو یہ تھی کہ آپؐ اللہ کے نبی اور رسول تھے اور دوسری یہ کہ آپؐ مسلمانوں کی اس جماعت کے امیر اور امام تھے!

حکومت اور جماعت کے مابین بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ جماعت کی کوئی علاقائی عملداری (territorial jurisdiction) نہیں ہوتی اور اس میں شرکت و شمولیت بھی اختیاری (voluntary) ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علیحدگی کا اختیار بھی ہر دم حاصل رہتا ہے۔ پھر اس میں کام بھی رضا کارانہ کیا جاتا ہے اور کارکنوں سے زیادہ تندہی سے کام کرانے کے لیے صرف ترغیب و تشویق سے کام لیا جاتا ہے' یا زیادہ سے زیادہ جماعت سے اخراج کی وعید سنائی جا سکتی ہے' کوئی عملی سزا نہیں دی جا سکتی... جبکہ حکومت کی ایک علاقائی عملداری ہوتی ہے' اور اس علاقے میں رہنے والے سب لوگ اس میں لا محالہ شامل ہوتے ہیں اور انہیں اس کے احکام کی اطاعت مجبوراً کرنی پڑتی ہے اور اس علاقے سے نکلے بغیر اس کے احکام سے سرتابی جرم یا بغاوت کے ہم معنیٰ قرار پاتی ہے جس کی سزا لازمی ہوتی ہے۔

84

اس اصولی فرق و تفاوت کو سامنے رکھتے ہوئے اب فتح مکہ سے قبل اور اس کے بعد کے حالات پر نظر ڈالیے تو یہ فرق صاف نظر آتا ہے کہ شوال ۳ھ میں غزوۂ اُحد کے موقع پر ''مسلمانوں'' کی جماعت میں سے ایک تہائی تعداد میدانِ جنگ سے واپس ہو گئی لیکن اس پر نہ کسی باز پرس کا ذکر سیرتِ مطہرہ میں ملتا ہے نہ سزا یا عقوبت کا! (حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ کسی ''حکومت'' میں ہو تو کورٹ مارشل اور سخت ترین سزا لازم ہے!) اسی طرح ۶ھ

میں عمرہ کے لیے چلنے کے لیے نفیر عام تھی‘ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ نہیں گئے ان پر سورۃ الفتح میں شدید تنقید تو کی گئی اور زجر و توبیخ سے بھی کام لیا گیا‘ لیکن معلوم ہے کہ اس پر نہ کسی معین شخص کا کوئی محاسبہ کیا گیا نہ سزا دی گئی ... جبکہ اس کے برعکس غزوۂ تبوک کے موقع پر جو لوگ بغیر پیشگی اجازت حاصل کیے عملاً شریک نہ ہوئے ان کا محاسبہ بھی ہوا‘ اور صرف ان منافقین سے اعراض کرتے ہوئے جنہوں نے جھوٹی قسموں کو ڈھال بنا کر اپنے آپ کو بچا لیا‘ جن مخلص مسلمانوں نے قصور کا اعتراف کیا انہیں بالفعل سزا دی گئی‘ اور منافقوں کے خلاف بھی اگرچہ فرداً فرداً تو کوئی اقدام نہیں کیا گیا لیکن ان کے مسجد نما مرکز (مسجد ضِرار) کو مسمار کر دیا گیا۔

مزید برآں غور کیجیے کہ کیا کوئی ''حکومت'' ایسی بھی ہو سکتی ہے جس کے شہریوں کو یہ اختیار حاصل ہو کہ چاہیں تو اپنے مقدمات حکومت کی قائم کردہ عدالتوں سے طے کرائیں اور چاہیں تو کہیں اور لے جائیں۔ اور کیا کسی حکومت کے لیے جائز ہے کہ اپنے شہریوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے اور ان کے جھگڑوں کو چکانے سے احتراز کرے... جبکہ واقعہ یہ ہے کہ فتح مکہ سے قبل تک مدینہ منورہ میں بالفعل یہ بھی ہوتا تھا کہ اوس اور خزرج کے منافق اپنے مقدمات نبی اکرم ﷺ کی بجائے یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے اور خود آنحضور ﷺ کو بھی اجازت تھی کہ آپؐ چاہیں تو ان کے مقدموں اور جھگڑوں کا فیصلہ کریں اور چاہیں تو انکار کر دیں۔ (۱)

یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ ہجرت کے بعد بھی کم از کم فتح مکہ تک ابھی انقلابی

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں !)

جدوجہد کا سلسلہ جاری تھا‘ اور مسلمانوں کی حیثیت ایک انقلابی جماعت کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران میں تو ان کے لیے ''امت'' یعنی ہم مقصد لوگوں کا لفظ استعمال ہوا ہے اور سورۃ المائدہ اور سورۃ المجادلہ میں ''حزبُ اللہ'' یعنی اللہ کی پارٹی یا جماعت کا ! حکومت یا ریاست کا لفظ تو خیر پورے قرآن میں کہیں آیا ہی نہیں‘ اس کے مترادف الفاظ بھی کہیں استعمال نہیں کیے گئے ... اس لیے کہ با ضابطہ ''حکومت'' قائم ہی اُس وقت ہوئی تھی جب وحی کی ''تنزیل'' اختتام کو پہنچ رہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ حکومت و ریاست اور کسی باقاعدہ اور با ضابطہ نظام کا بالفعل ظہور تو دراصل ''خلافت راشدہ'' کے دوران ہوا ہے !

مزید غور کرنے سے صاف نظر آتا ہے کہ ہجرت کے بعد بھی کئی سال تک مسلمانوں کی ''جماعت'' میں یہ درجہ بندی برقرار رہی کہ عہد حاضر کی اصطلاح کے مطابق اصل ''ارکانِ جماعت'' تو صرف وہ مہاجرین مکہ تھے (رضوان اللہ علیہم اجمعین) جو مکہ مکرمہ میں نبی اکرم ﷺ کی تعلیم اور تربیت و تزکیہ سے بھی بھرپور طور پر فیض یاب ہو چکے تھے‘ اور نہ صرف یہ کہ وہاں شدید مصیبتوں اور آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے گزر کر کندن بن چکے تھے بلکہ

گھر بار اور اہل و عیال کو کفارِ مکہ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر کے اپنے ایمان و یقین اور خلوص و اخلاص کا آخری ثبوت بھی فراہم کر چکے تھے ... جبکہ انصارِ مدینہ کی اصل حیثیت ''معاونین'' اور ''پناہ دینے والوں'' کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غزوۂ بدر سے قبل کی آٹھ

(۱) {سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾} (المائدہ)

''(یہ یہودی) جاسوسی کرنے والے ہیں جھوٹ بولنے کے لیے اور بڑے حرام کھانے والے ہیں۔ سو اگر یہ آپؐ کے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں تو (آپؐ کو اختیار ہے کہ) خواہ آپؐ ان کے مابین فیصلہ کر دیں یا ان سے منہ پھیر لیں۔ اور اگر آپؐ ان سے منہ پھیر لیں گے تو یہ آپؐ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ اور اگر آپؐ فیصلہ کریں تو پھر ان کے مابین انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے۔ یقینا اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

مہموں میں' جن میں سے بعض سرایا تھے اور بعض غزوات (اس لیے کہ ان میں خود آنحضور ﷺ نے بھی بنفس نفیس شرکت فرمائی تھی) صرف مہاجرین کو شریک کیا گیا تھا اور کسی انصاری کو شامل نہیں کیا گیا ...یہاں تک کہ غزوۂ بدر سے قبل کی مشاورت میں بھی جبکہ آنحضور ﷺ کو وحی الٰہی نے مطلع فرما دیا تھا کہ ایک لشکرِ جرار مکہ سے روانہ ہو چکا ہے' آپؐ نے انصارِ مدینہ کو مہم میں شرکت کا ''حکم'' نہیں دیا بلکہ مشورہ طلبی کے جواب میں مہاجرینؓ کی جاں نثارانہ اور سرفروشانہ تقاریر کے باوجود مزید توقف فرما کر صرف اپنا عندیہ ظاہر کیا تھا 'جس پر رئیس انصار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما بول اٹھے کہ: ''یا رسول اللہ ! غالباً آپؐ کا روئے سخن ہماری جانب ہے !'' اس کے بعد بھی انہوں نے حوالہ ''بیعتِ سمع و طاعت'' کا نہیں دیا (اس لیے بھی کہ آنحضور ﷺ نے کوئی حکم تو دیا ہی نہیں تھا کہ اطاعت کا سوال پیدا ہوتا اور اس لیے بھی کہ بیعتِ عقبہ کے موقع پر طے یہ ہوا تھا کہ اگر مدینہ پر حملہ ہوا تو ہم آپ ﷺ کی حفاظت بالکل اسی طرح کریں گے جیسی اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں اور یہاں ابھی مدینہ پر حملہ کی صورت پیش نہیں آئی تھی !) بلکہ یہ عرض کیا کہ ''ہم آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں اور ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے !'' ... تو غور فرمایئے کہ یہ ساری صورت ''رضا کارانہ'' تعاون کی ہے یا حکومت کے فوجی ڈسپلن کی جس میں فوج کے لیے رضا کارانہ بھرتی ہوتی ہے تب بھی سب شہریوں میں سے یکساں طور پر' اور اگر جبری خدمت لی جاتی ہے تب بھی سب سے برابری کے ساتھ... لہٰذا اگر وہاں معاملہ ''انقلاب'' کی تکمیل اور اسلامی حکومت کے قیام کے بعد انقلاب کی توسیع کا ہوتا تو کسی بھی مرحلے پر مہاجرین اور انصار کے مابین کوئی فرق ہرگز روا نہ رکھا جاتا۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد سورۃ الانفال نازل ہوئی تو اس میں بھی مسلمانوں کی جماعت کے ان دونوں حصوں کے لیے جدا جدا الفاظ استعمال ہوئے 'یعنی مہاجرین کے

لیے {وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ} (الانفال:۷۴) ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا'' ... اور انصارِ مدینہ کے لیے صرف یہ کہ {وَالَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّ نَصَرُوۡۤا}

''اور وہ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی!'' البتہ فتح مکہ کے بعد جب معاملہ ''حکومت'' کی صورت اختیار کر گیا اور سب اس کے یکساں شہری بن گئے تو سورۃ التوبہ میں مہاجرین اور انصار کو ان الفاظ میں یکجا اور یکساں کر دیا گیا کہ: {وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِیۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ وَالَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ بِاِحۡسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ} (آیت ۱۰۰)

''مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ السابقون الاوّلون میں شامل ہیں' اور وہ جنہوں نے حسن و خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی' اللہ بھی ان سب سے راضی ہو گیا' اور وہ سب بھی اللہ سے راضی ہو گئے!''

اس بحث کا دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت اگرچہ جزیرہ نمائے عرب میں کوئی با ضابطہ حکومت یا سلطنت قائم نہیں تھی' تاہم اگر کسی درجہ میں ایک ڈھیلی ڈھالی ''مذہبی حکومت'' قائم تھی تو اس کا صدر مقام مکہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ''اُمّ القُریٰ'' (الشوریٰ: ۷) یعنی بستیوں کی ماں یا جڑ سے تعبیر کیا گیا۔ عرب کے حاکموں کی حیثیت اگر کسی کو حاصل تھی تو وہ صرف قریش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نص قرآنی میں بھی انہیں ''اَئِمَّۃَ الۡکُفۡرِ'' (التوبۃ:۱۲) قرار دیا گیا اور حدیث ِنبویؐ نے بھی ((الائمۃ من قُرَیْش)) (رواہ احمدؒ عن ابی ہریرہؓ) کے الفاظ کے ذریعے اس کی مزید تاکید کر دی۔ گویا جب تک مکہ پر فتح کا پرچم نہ لہرا دیا جاتا عرب میں نہ کسی حکومت کے قیام کا سوال پیدا ہو سکتا تھا نہ انقلاب کی تکمیل کا۔ اس سے قبل کسی محدود علاقے میں مسلمانوں کو ''دار الامن'' میسر آجانا اور اس میں ایک محدود حد تک نبی اکرم ﷺ کے احکام کا ان لوگوں پر جاری ہو جانا جو از خود رضا کارانہ طور پر اس کے خواہاں ہوں بالکل دوسری بات ہے۔ (چنانچہ ہجرتِ مدینہ سے قبل یہی حیثیت مکہ میں ''دارِ ارقمؓ'' کی تھی جو ان سب نوجوان مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ بن گیا تھا جنہیں گھروں سے نکال دیا جاتا تھا۔ اس سے بھی قبل یہی معاملہ خود حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے مکان یعنی کاشانۂ نبوتؐ کا تھا کہ اس کی چار دیواری کے اندر ''اسلامی حکومت'' بالفعل قائم تھی' جہاں نبی اکرم ﷺ حضرت خدیجہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی معیت میں ''نمازِ با جماعت'' بھی ادا فرماتے تھے' اور ظاہر ہے کہ آپؐ

کے احکام بھی جاری و نافذ تھے!)

الغرض' یہ خیال کہ مدینہ منورہ میں ہجرت سے قبل ہی ''انقلاب'' کی تکمیل ہو گئی تھی اور ہجرت کے فوراً بعد ایک اسلامی حکومت یا ریاست قائم ہو گئی تھی صرف ''خیالِ خام'' ہی نہیں' تاریخی حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف ہے!

یہیں سے ایک نہایت مشکل سوال کا آسان حل بھی مل جاتا ہے' یعنی یہ کہ کیا وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں نبی اکرم ﷺ بنفس ِ نفیس بارہ برس تک دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تلقین کے فرائض ادا کرتے رہے لیکن وہاں آپؐ کی ''دعوت'' سے تو انقلاب نہیں آیا بلکہ حالات رفتہ رفتہ اس درجہ نا موافق اور نا مساعد ہوتے چلے گئے کہ آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو وہاں سے ہجرت کرنی پڑی' جبکہ یثرب میں ابھی آپؐ کے قدم مبارک پہنچے بھی نہیں تھے کہ اوّلاً حج کے موقع پر چند لوگوں کے ایمان لانے اور بعد ازاں ان کی اور آپؐ کے مکہ سے بھیجے ہوئے ایک دو جاں نثاروں کی دعوت و تبلیغ سے دیکھتے ہی دیکھتے اتنی کامیابی حاصل ہو گئی کہ وہ ''دار الہجرت'' بننے کی سعادت کا اہل ہو گیا؟ ہمیں نہیں معلوم کہ فاضل مقالہ نگار نے اس اہم سوال پر غور کیا ہے یا نہیں' اگر کیا ہے تو ان کے پاس اس کا کیا جواب ہے۔ بہر حال ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ مکہ مکرمہ نہ صرف یہ کہ پورے عرب کی بے ضابطہ مذہبی حکومت کا صدر مقام تھا بلکہ بجائے خود بھی صرف ایک قبیلہ کا شہر ہونے کی بنا پر ایک نہایت مضبوط ''حکومت'' کا حامل تھا' جس کی ایک پارلیمنٹ بھی تھی (دار الندوہ) اور مختلف منصب اور عہدے بھی تھے۔ لہٰذا وہاں انقلاب کی تکمیل کے تقاضے زیادہ کٹھن تھے۔ جبکہ یثرب میں اس اعتبار سے ایک ''خلا'' کی سی کیفیت تھی اور اس کی حیثیت پانچ قبیلوں کے مابین ایک ایسے ڈھیلے ڈھالے ''وفاق'' کی تھی جس میں کوئی ''مرکزی حکومت'' سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ پھر ان پانچ قبیلوں میں سے بھی جو دو قبیلے اصل ''مالکانِ دیہہ'' کی حیثیت رکھتے تھے' یعنی اوس اور خزرج' ان کے مابین کچھ ہی عرصہ قبل طویل اور نہایت خونریز جنگ ہو چکی تھی۔ گویا وہ سرزمین کسی ''ثالث بالخیر'' کی منتظر تھی جو اسے محمد رسول اللہ ﷺ کی صورت میں میسر آگیا اور

پؐ نے کمال تدبر و فراست کے ساتھ متذکرہ بالا ''خلا'' کو اپنی اس ''جماعت'' کے ذریعے پُر کر کے جو مکی دور کے بارہ سالہ عمل ِ دعوت و تبلیغ' تربیت و تزکیہ اور تنظیم و صبر محض کے نتیجے میں ہر اعتبار سے ع ''چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت ِ جم زن'' کی اہل ہو چکی تھی' اسے اپنے مقصد ِ بعثت یعنی غلبہ ٔ دین حق کی ''انقلابی جدو جہد'' کے لیے استعمال فرما لیا۔ تاہم تھا یہ صرف ایک جماعتی نظام جس کے ساتھ یثرب کا قدیم قبائلی نظام جس پختگی کے ساتھ برقرار رہا تھا اس کا اندازہ اس سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ ہجرت کے چھٹے سال اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کے سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کو جتنی اذیت رئیس المنافقین عبد اللہ بن اُبی سے پہنچی وہ آپؐ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ: ''کیا کوئی بھی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو مجھے اس شخص سے بچا سکے جو مجھے میرے گھر والوں کے بارے میں ایذا دے رہا ہے؟'' (زاد المعاد' جلد دوم) لیکن مدینہ کا قبائلی نظام اتنا محکم تھا کہ رئیس خزرج حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما نے آنحضور ﷺ کو تو صرف ''مصلحت بینی'' کا مشورہ دینے پر اکتفا کی' لیکن اوس کے سردار حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے یہاں تک کہہ دیا کہ تم عبد اللہ بن اُبی کی مخالفت میں

اتنے تیز و تند جذبات کا مظاہرہ اس لیے کر رہے ہو کہ وہ قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتا ہے' جس کا جواب حضرت اسیدؓ نے بھی ترکی بہ ترکی دیا ...تاہم عبد اللہ بن اُبی کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی جا سکی ! ... تو غور فرمایئے کہ یہاں آنحضور ﷺ کی حیثیت ایک ''حاکم'' کی نظر آ رہی ہے یا ایک ایسی جماعت کے امیر اور امام کی جس کی ریڑھ کی ہڈی تو مہاجرین پر مشتمل تھی لیکن تعداد کے اعتبار سے زیادہ اور اہم تر لوگ اوس اور خزرج سے تعلق رکھنے والے وہ انصار تھے جن میں جہاں مومنین صادقین بھی کثیر تعداد میں موجود تھے' وہاں معتد بہ تعداد میں ضعفاء اور منافقین بھی شامل تھے ! ان سب کا تعلق جہاں ایک جانب بحیثیت مسلمان آنحضور ﷺ کے ساتھ قائم ہو گیا تھا وہاں اپنے قبائلی نظام کے ساتھ بھی پوری طرح شدت کے ساتھ برقرار تھا !

اس مرحلے پر' ان لوگوں سے قطع نظر جو اسلامی انقلاب کی جدو جہد کو ع ''کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا !'' کے مترادف سمجھتے ہوں اور اپنے ذہن و فکر کی جملہ

صلاحیتوں کو ؎

''تپتی راہیں مجھ کو پکاریں دامن پکڑے چھائوں گھنیری !''

کے مصداق اس سے گریز اور فرار کی راہیں تلاش کرنے ہی میں صرف کرنا چاہیں' ایسے تمام لوگوں کو جو اسلامی انقلاب سے حقیقی اور عملی دلچسپی رکھتے ہوں اپنی بصیرت میں اضافے کے لیے اس سوال پر غور کر لینا چاہیے کہ اگر مکہ مکرمہ میں آنحضور ﷺ کا اپنی انقلابی جدو جہد کو جاری رکھنا اس لیے مشکل ہو گیا تھا کہ وہاں ایک حکومتی نظام موجود تھا' چنانچہ اس جدو جہد کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مدینہ منورہ میں ''پناہ دی'' (الانفال: ۲۶)(۱) جہاں حکومت کا ''خلا'' تھا ... تو آج کی دنیا میں جہاں ہر جگہ مضبوط حکومتیں قائم ہیں جو اپنے ملک میں رائج اجتماعی نظام یعنی ''پولیٹیکو سوشیو اکنامک سسٹم'' کی محافظ ہوتی ہیں اور جن کے پاس بری' بحری اور فضائی افواج کی کثیر تعداد کے علاوہ سول آرمڈ فورسز کی بھی بڑی جمعیت موجود ہوتی ہے' کوئی انقلابی جدو جہد کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟

اس سوال کا ''اشکال'' مزید بڑھ جاتا ہے اگر اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ نبی اکرم ﷺ کے دست ِمبارک سے کُل بیس برس کی قلیل مدت میں انقلاب کی معجزانہ تکمیل میں جہاں اصل دخل آپؐ کی بے داغ سیرت اور معجزانہ کردار' اور آپؐ کی اور آپؐ کے صحابہؓ کی بے مثال محنت و مشقت اور عدیم النظیر قربانیوں' جان فشانیوں اور سرفروشیوں کو حاصل تھا' وہاں کچھ نہ کچھ عمل دخل اس کیفیت کو بھی تھا کہ اُس وقت جزیرہ نمائے عرب میں کوئی ایسی منظم اور مستحکم حکومت قائم نہیں تھی جو انقلاب کا راستہ پوری قوت کے ساتھ روک

سکتی۔ اس پر فطری طور پر یہ سوال زیادہ گھمبیر اور شدید ہو جاتا ہے

(۱) {وَاذْکُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىکُمْ... الخ}
''اور وہ وقت یاد کرو جب کہ تم (تعداد میں) تھوڑے تھے' زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا' تم ڈرتے تھے کہ مبادا لوگ تم کو اچک لیں' پھر اس نے تمہیں جائے پناہ مہیا کر دی...''

کہ آج کسی ایسے ملک مثلاً پاکستان میں انقلاب کا خواب کیسے دیکھا جا سکتا ہے جہاں ایک مستحکم حکومتی نظام اپنے پورے لائو لشکر کے ساتھ موجود ہو' جو رائج الوقت سیاسی و معاشی نظام یعنی جاگیرداری اور سرمایہ داری ہی کے بل پر وجود میں بھی آتا ہو اور پھر اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کی حفاظت بھی کرتا ہو!

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عہد حاضر میں تمدنی ارتقاء کے ذریعے ''حقوقِ انسانی'' کا جو تصور پروان چڑھا اور پوری دنیا میں تسلیم شدہ ہے اس کی رو سے عوام کو عقیدہ' خیال اور نظریے کی آزادی کے ساتھ یہ حق بھی حاصل ہے کہ اس کا اظہار و اعلان بھی کریں اور تبلیغ و اشاعت بھی۔ مزید برآں شہریوں کا یہ حق بھی اب پوری طرح تسلیم شدہ ہے کہ وہ جماعتیں اور تنظیمیں بنائیں اور وقت کی حکومت ہی نہیں رائج الوقت نظام کو بھی بدلنے کی کوشش کریں' بشرطیکہ امن عامہ میں خلل نہ ڈالا جائے اور کسی کی جان' مال' عزت' آبرو اور املاک کو نقصان نہ پہنچایا جائے ... پھر تبدیلی کی یہ کوشش انتخابات میں حصہ لے کر بھی کی جا سکتی ہے' اور پُر امن مظاہروں اور احتجاجی تحریکوں کے ذریعے بھی' یہ دوسری بات ہے کہ انتخابات کے ذریعے صرف ''حکومت'' کو بدلا جا سکتا ہے ''نظام'' کو نہیں اور انقلاب چونکہ نظام کو بدلنے کا نام ہے لہٰذا اس کے لیے مزاحمتی تحریک (Resistance Movement) کے سوا کوئی اور چارۂ کار موجود نہیں ہے۔

اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عہد حاضر میں ''انقلاب'' کے لیے ''مسلح بغاوت'' ضروری نہیں ہے (اگرچہ ہمارے دونوں فاضل مضمون نگار بجا طور پر فقہ اور شریعت کی رو سے اس کی مشروط اجازت کے قائل ہیں' اور دونوں نے اس کے بارے میں فقہی مباحث پر خواہ مخواہ زورِ انشاء صرف کیا ہے' حالانکہ نہ یہ معاملہ مابہ النزاع ہے' نہ ہی ہمارے نزدیک عہد حاضر میں انقلاب کے لیے قتال ناگزیر ہے!) ... اسی طرح عہد حاضر میں ''ہجرت'' بھی لازم نہیں رہی ہے (اگرچہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اگر اس کا امکان موجود ہو تو اس سے بلا شبہ انقلابی جدوجہد میں آسانی اور سہولت حاصل ہو سکتی ہے!)

بحث کے آخری اور تیسرے نکتے پر گفتگو کے آغاز کے لیے الحمد للہ کہ ہمارے پاس ایک متفقہ اساس موجود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ راقم الحروف کو زیر تبصرہ مقالہ کے مصنف کی بعض سابقہ تحریروں کی بنا پر یہ گمان تھا

کہ شاید وہ بالکلیہ اسی ''معذرت خواہ'' مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندوستان میں انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزوں کے عسکری' سیاسی' سائنسی اور نفسیاتی غلبے کے زیر اثرپیدا ہوا تھا' لہٰذا ہمیں اس سے بہت خوشی ہوئی ہے کہ انہوں نے نہایت واضح اور برملا الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ:

''قرآن مجید کی روسے رسول اللہ ﷺ جزیرہ نمائے عرب میں اس توسیع (یعنی اسلامی انقلاب کی توسیع) کے لیے اسی طرح مامور تھے جس طرح آپؐ کے بعد آپؐ کی یہ امت عالم کے آخری کناروں تک اس کی توسیع کے لیے مامور ہے'' ... اور ... ''رسالت مآب ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ خلفائے راشدینؓ کی قیادت میں روم و ایران کی بادشاہتوں میں اس کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے ان کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر کہا تھا: اسلام لائو' جزیہ دو' یا لڑنے کے لیے تیار ہو جائو!''

لیکن اب وہ اور ان کے ہم خیال لوگ ذرا غور فرمائیں کہ اس اعتراف اور اعلان کے بعد: (۱) کیا ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' کے طعنے اور اس قبیل کے دوسرے طنز اور استہزاء کے تیر جو انہوں نے ہم پر برسائے ہیں وہ سب کے سب ''برکلۂ خودمی نمایند!'' کے مصداق ان ہی کی جانب نہیں لوٹ رہے؟ (۲) کیا اس سے ان کا یہ نظریہ کہ انقلاب ''دعوت اور صرف دعوت'' سے آتا ہے' باطل نہیں ہو جاتا؟ ... اور (۳) کیا ان کے تجزیے کے مطابق یہ درست نہ ہو گا کہ کوئی سرپھرا پاکستان کے کسی ایک گائوں میں ''دعوت اور صرف دعوت'' کے ذریعے ''انقلاب'' برپا کر کے پہلے پورے پاکستان اور پھر پوری دنیا میں اس کی ''توسیع'' کے لیے ''جہاد و قتال'' کا اعلان کر دے؟ اس پر اگر وہ یہ کہیں کہ ان کی مراد پورے ملک سے ہے تو پھر اس کا کیا جواب ہے کہ مدینہ منورہ پورا ملک تھا یا اس کا صرف ایک شہر اور وہ بھی ''اُمّ القریٰ'' نہیں بلکہ صرف ایک عام قریہ؟ بَیِّنُوا تُؤجَرُوا!

ہمیں یقین ہے کہ اگر موصوف ان سوالات پر غور کرنے کی زحمت گوارا کر لیں گے تو ان پر یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ بحمد اللہ نظریاتی اعتبار سے ہمارے اور ان کے مابین کوئی بنیادی فرق نہیں ہے' اور ہم اصلاً ایک ہی فکر کے خوشہ چین ہیں۔ چنانچہ یہ امور ہمارے مابین متفق علیہ ہیں کہ: (i) نبی اکرم ﷺ کا مقصد بِعثت غلبۂ دین حق تھا۔ (ii) آپ ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے: ایک اہل عرب کی جانب' اور دوسری پوری نوعِ انسانی کی جانب۔ (iii) پہلی بعثت کے جملہ فرائض آپؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے دوران ہی بنفس نفیس پورے کر دیے۔ چنانچہ اہل عرب پر اتمامِ حجت کا حق بھی ادا کر دیا' اور جزیرہ نمائے عرب پر غلبۂ دین حق کی تکمیل بھی فرما دی ... یہی وجہ ہے کہ مشرکین عرب کو سورۃ التوبہ کی آیات ۱ تا ۶ میں آخری الٹی میٹم دے دیا گیا کہ یا ایمان لائیں ورنہ تہ تیغ کر دیئے جائیں گے! (یہ دوسری بات ہے کہ بالفعل اس کی نوبت نہیں آئی اور تمام مشرکین

عرب ایمان لے آئے۔) (iv)بقیہ عالم انسانی کے ضمن میں ان دونوں فرائض کی ادائیگی کا بار امت کے کاندھوں پر ہے‘ جسے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے خلافت ِراشدہ کے دوران ایک حد تک تو پورا کر دیا تھا‘ تاہم ؎

وقت ِفرصت ہے کہاں‘ کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے !

کے مصداق اس کی تکمیل ابھی امت کے ذمہ قرض ہے ! (v)مشرکین عرب کے سوا دنیا کی تمام اقوام کے لیے اسلام کا ابدی منشور یہ ہے کہ ایمان لے آئیں تو {وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ} (المنافقون:۷) میں یہ برابر کے حصے دار بن جائیں گے‘ بصورتِ دیگر خواہ یہودی رہیں خواہ عیسائی‘ اور خواہ مجوسی رہیں خواہ ہندو‘ لیکن دین حق کی بالادستی کو تسلیم اور قبول کریں اور جزیہ ادا کریں۔تیسری صورت صرف جنگ کی ہے... چنانچہ یہ ’’ابدی منشور‘‘ بھی سورۃ التوبہ ہی کی حسب ذیل آیت میں مذکور ہے:
{قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا

الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّ ہُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾}
’’جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ روزِ آخر پر اور نہ حرام جانتے ہیں اُس کو جس کو حرام قرار دیا اللہ اور اُس کے رسولؐ نے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے‘ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔‘‘
اب وہ ذرا ان امور پر بھی غور کرنے کی زحمت گوارا فرما لیں تو ہمارے اور ان کے مابین اختلاف کی خلیج بالکل ہی ختم ہو جائے گی کہ... (i)سورۃ التوبہ میں وارد ان دونوں آخری اعلانات سے میثاقِ مدینہ سمیت اس سے قبل کے جملہ معاہدات اور وثائق منسوخ اور کالعدم ہو گئے تھے۔ (ii)اب جو فرض امت کے ذمہ ہے اس کی ادائیگی کی واحد صورت یہ ہے کہ پھر کسی ملک میں از سر نو انقلابی جدو جہد کے ذریعے نام نہاد مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ ’’حقیقی اسلامی حکومت‘‘ قائم کی جائے۔ (iii)اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اس کے لیے اہم ترین اور اولین کام ’’دعوت‘‘ ہی کا ہے... اور خود اس کا حق وسیع پیمانے پر ادا کرنے کے لیے بھی ’’تنظیم‘‘ اور ’’تربیت‘‘ دونوں لازمی ہیں۔ (iv)تنظیم کے لیے آپ ’’بیعت سمع و طاعت فی المعروف‘‘ کے الفاظ سے خواہ مخواہ الرجک نہ ہوں... اس لیے کہ کم از کم ایک فردِ نوع بشر نے تو یہ بیعت خود آپ کے ہاتھ پر بھی کی ہوئی ہے۔ ہماری مراد آپ کی اہلیہ صاحبہ محترمہ

سے ہے، جو {فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ} کی قرآنی نص (۱) کے مطابق آپ کی ''اطاعت فی المعروف'' کی پابند ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ وہ آپ کو دلیل یا اپیل سے اپنی رائے کا قائل کر لیں... ''بیعت سمع و طاعت فی المعروف'' کے اصول پر قائم ہونے والی جماعت کی بھی حقیقی نوعیت اس سے زیادہ نہیں ہے !

* * *